X-Files - Horror Show
سے منتخب خوفناک تحریریں
بدروحوں کا مسکن
PDFBOOKSFREE.PK
خرم سرفراز

☆......☆......☆

بد روحوں کا مسکن

بھینٹ چڑھائے جانے والے جسموں کے پنجروں کا ایک ڈھیر چٹان کے قریب پڑا تھا اور جب نیم تاریک غار میں مشعلوں کی روشنی ان ڈھانچوں پر پڑتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے بھیانک بلائیں رقص کر رہی ہوں --- موت کا رقص۔

قربان گاہ کی چٹان پر جابجا خون کی جمی ہوئی دھاریاں گزرے ہوئے برسوں کے ساتھ سیاہی مائل ہو چکی تھیں۔

غار کی نیچی چھت مشعلوں کی دھویں سے سیاہ ہو چکی تھی۔ قربانی کی رسم کے مطابق دو آدمی قربان گاہ تک گئے۔ ان کے گرد ڈھول بجانے والوں کا ایک چھوٹا سا گروہ تھا۔ جن کے پسینے میں نہائے ہوئے سیاہ جسم چمک رہے تھے۔ ڈھول کی آواز آہستہ آہستہ تیز ہوتی چلی جا رہی تھی حتیٰ کہ اس آواز کو سن کر ایک عجیب سی وحشت اور دیوانگی کا احساس ہونے لگا۔ ایک آدمی سفید چغہ پہنے ہوئے تھا جب کہ دوسرے نے بھڑکیلے رنگ کا لباس زیب تن کر رکھا تھا جو مشعلوں کی روشنی میں آگ کی طرح دہک رہا تھا۔

جونہی وہ بھینٹ دینے والی چٹان کے نزدیک پہنچے' دوسرے آدمی نے ایک چھوٹا سا صندوق نکالا جو ریشم میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے وہ صندوق ایک ہاتھ سے سنبھالا اور دوسرے ہاتھ سے اس پر پڑا ہوا کپڑا ہٹا دیا۔ یہ ایک چھوٹا سا تابوت تھا جس میں کپڑے کی بنی ہوئی ایک گڑیا رکھی تھی۔ یہ ایک عورت کا پتلا تھا۔

پہلا آدمی تابوت پر جھکا اور پھر اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں اوپر اٹھا کر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کچھ گا رہا ہو۔ ڈھول کی آواز مدھم ہوتے ہوتے آہستہ آہستہ معدوم ہو گئی لیکن فضا میں بد روحوں کا افسوں بدستور چھایا رہا --- "کاوا۔ توسترا۔ کاوا۔ ا سترا۔" جادو کے بول ابھی تک غار میں گونج رہے تھے۔

قربان گاہ سے ڈیڑھ میل دور ایک چھوٹے سے گاؤں کے ایک مکان میں ایک نوخیز دوشیزہ جو محو خواب تھی' اچانک سوتے میں بڑبڑانے لگی۔ اس کے لبوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس کے لب وا ہوئے اور اس نے خواب آلود آواز میں گنگنانا شروع کر دیا۔ "کاوا۔ توسترا۔ کاوا۔ ایسترا۔ کاوا۔"

سفید چغے والے آدمی نے بڑی احتیاط سے تابوت کو قربان گاہ کے چبوترے پر رکھ دیا اور اپنے لباس سے شیشے کی ایک چھوٹی سی نلکی نکالی۔ مشعلوں کی تیز روشنی میں نلکی میں جیسے ایک سرخ شعلہ سا بھڑکا۔ یہ خون تھا۔ سرخ خون۔ جو مشعلوں کی روشنی میں بہت بھیانک نظر آ رہا تھا۔ ہر طرف ایک روح فرسا خاموشی چھا گئی۔

جادوگر نے اس نلکی کو آسمان کی طرف بلند کیا اور پھر آہستہ سے اسے اپنے لبوں سے لگا لیا۔ اس نے بڑی تیزی سے خون کا ایک بڑا سا گھونٹ اپنے منہ میں بھر لیا اور پھر بجلی کی سی سرعت سے عورت کے پتلے پر اگل دیا۔

دور گاؤں میں بے چینی سے کروٹیں بدلتی ہوئی نوخیز دوشیزہ نے ایک دلخراش چیخ ماری اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ ہذیانی انداز میں بڑبڑا رہی تھی اور اس کے بازو پر بندھی ہوئی پٹی کے زخم سے خون رس رس کر اس کی کہنی کو تر کرنے لگا تھا۔

☆○☆

کاؤنٹ کارلائل ان دنوں محض تفریح کے موڈ میں تھے۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ کسی قیمت پر بھی اپنی چھٹیوں کو غارت نہیں ہونے دیں گے۔ انہوں نے پہلے ہی اپنا سارا پروگرام مرتب کر لیا تھا۔ اور اب وہ تیزی سے اپنی ساری تیاریاں مکمل کر رہے تھے۔ وہ تصور ہی تصور میں خود کو لندن کی مصروف ترین زندگی اور گہما گہمی سے دور اسکاٹ لینڈ کی خاموش اور پرسکون فضا میں گنگناتی ندی کے کنارے مچھلی پکڑتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ لیکن برا ہو اس لمحے کا جب خیالوں میں محو کاؤنٹ کارلائل کے سارے پروگرام چوپٹ ہو کر رہ گئے۔ ان کی بیٹی سٹڈی روم میں آئی اور ڈاک کے لفافوں کا ایک پلندا میز پر لا کر پٹخ دیا۔ کاؤنٹ جان بوجھ کر اس ڈاک سے نظریں چرانے لگے۔

گلوریا میز کے قریب کھڑی ان کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ کاؤنٹ کارلائل

اس کی طرف دیکھ کر یوں مسکرائے جیسے کہہ رہے ہوں۔ "میں بہت مصروف ہوں۔" وہ ان کی عادتوں سے اچھی طرح واقف تھی لیکن پھر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ کاؤنٹ کارلائل نے ایک جمائی لی اور گویا ہوئے۔ "اچھا بھئی۔ بتاؤ کیا معاملہ ہے؟"

گلوریا نے اپنی آنکھیں جھپکائیں۔ اس کی آنکھیں سبزی مائل سرخ تھیں۔ اسے ہرنی جیسی یہ خوبصورت آنکھیں اپنی ماں سے ورثے میں ملی تھیں۔ کاؤنٹ کارلائل ایک بار پھر ماضی کے ان ایوانوں میں کھو گئے جہاں انہیں اپنی دلنشیں بیوی کی یادیں رقصاں نظر آتی تھیں۔

یہ صحیح تھا کہ ان کی شریک حیات کو موت کے ظالم ہاتھوں نے ان سے چھین لیا تھا لیکن وہ خوش تھے کہ گلوریا کے روپ میں ان کی زندگی کا یہ خلا پر ہو گیا تھا۔ وہ بالکل اپنی ماں کی طرح باوقار تھی اور دلکش خدوخال کی مالکہ بھی۔ وہ ہر مرحلے پر اپنے باپ کا ساتھ دینے کے لئے بخوشی تیار رہتی اور ان کا ہر کام اپنا اولین فرض سمجھ کر کرتی۔ وہ کسی طرح بھی اپنی ماں سے کم نہیں تھی۔ کاؤنٹ کارلائل اپنی زندگی کا گلوریا کے بغیر کوئی تصور ہی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ دونوں یونہی ہنستے کھیلتے' روٹھتے ہنستے اپنی زندگی میں خوشیاں بکھیرتے رہتے۔

گلوریا نے خطوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ایک خط ٹارلٹن کی طرف سے آیا ہے۔"

"ٹارلٹن؟ یہ کون ہے؟" کاؤنٹ کارلائل کے لہجے سے حیرت ظاہر تھی۔

گلوریا مسکرائی۔ "یہ کسی آدمی کا نام نہیں ہے۔ یہ کارنوال کے ایک گاؤں کا نام ہے۔"

"لیکن میں تو وہاں کسی آدمی سے واقف نہیں ہوں۔" کاؤنٹ کارلائل نے کہا۔ گلوریا نے اپنے سنہرے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے یاقوتی ہونٹ سختی سے بھنچ گئے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ کاؤنٹ کارلائل جان بوجھ کر تغافل برت رہے ہیں۔ کاؤنٹ کارلائل نے کچھ دیر تامل کیا۔ پھر نیم دلی سے خط گلوریا کے ہاتھ سے لے کر کھولا۔ یہ خط ان کے ہونہار شاگرد ڈاکٹر والٹ نے ٹارلٹن سے لکھا تھا۔ ڈاکٹر

والٹ گلوریا کی عزیز ترین سہیلی ماریا کا شوہر تھا اور دو برس پہلے ماریا اور والٹ ٹارلٹن گاؤں میں جا بسے تھے۔

کاؤنٹ کارلائل بک شیلف کے قریب کھڑے ہو کر خط کو بغور پڑھنے لگے۔ انہوں نے کئی بار خط کو پڑھا لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی کہ آخر ان کا یہ ذہین و فطین شاگرد اس قدر مبہم سا خط کس حساب میں لکھ رہا تھا۔ گلوریا بڑے غور سے کاؤنٹ کارلائل کی پیشانی پر فکرو تردد کی لکیریں دیکھ رہی تھی۔ اس سے رہا نہ گیا۔ آخرکار وہ بولی۔

"کیا بات ہے۔ آپ کچھ پریشان ہیں۔ ٹارلٹن میں سب خیریت تو ہے؟"

"خیریت۔" کاؤنٹ کارلائل نے کہا۔ "مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے ---" کاؤنٹ کارلائل نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور گلوریا کی موجودگی نظرانداز کرتے ہوئے پھر خط پڑھنا شروع کر دیا۔

انہیں یوں لگا جیسے خط کا ایک ایک لفظ ہمدردی' رحم اور خوف کے علاوہ مدد کی درخواست کرتا ہوا کمرے کی خاموشی میں گونج رہا ہو۔ یہ ایک مایوس اور بے آس آدمی کی اپیل تھی لیکن کاؤنٹ کارلائل کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا کہ یہ ان کے بہترین شاگرد ڈاکٹر والٹ کی تحریر ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد والٹ نے یہ چند سطریں گھسیٹی ہیں۔

نوجوان ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ --- "اس کا گاؤں پراسرار اور مہلک قسم کے عارضوں کی زد میں ہے۔ لوگ مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں۔"

"لوگ مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں۔" کاؤنٹ کارلائل بڑبڑائے۔ انہیں اس روایتی تشبیہ سے سخت الجھن ہوتی تھی۔ کم از کم کاؤنٹ کارلائل کو والٹ سے اس مایوسی کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ انہوں نے آگے پڑھا۔ جگہ جگہ والٹ نے ان سے مدد کی درخواست کی تھی۔ ان سے مشورہ طلب کیا تھا۔ لیکن اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی تھی کہ آخر وہ ان سے کس قسم کی اور کس نوعیت کی امداد یا مشورے کا خواہاں ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے زندگی کی رمق اس کی تحریر سے رخصت ہو چکی ہو۔ جیسے زندہ رہنے کی خواہش سلب کر لی گئی ہو۔ ایک بے نام سی آس' بے

آسرا سی امید لئے اس نے یہ خط کاؤنٹ کارلائل کو لکھا تھا۔ کاؤنٹ کارلائل کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی ایسے مریض کی ایک جاں بلب انسان کی درخواست پڑھ رہے ہوں جس کے بدن سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا گیا ہو اور اب وہ موت کی دہلیز پر اپنے آخری مسیحا کا منتظر ہو۔

"ڈیڈی۔ آخر آپ مجھے بتاتے کیوں نہیں۔ بات کیا ہے؟" گلوریا نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

کاؤنٹ نے خط کا کچھ حصہ گلوریا کو پڑھ کر سنایا۔ لکھائی اس قدر خراب تھی کہ تحریر کی روانی جابجا بدخطی میں تبدیل ہو کر رہ گئی تھی۔ آخر پریشان ہو کر کاؤنٹ کارلائل نے خط گلوریا کے حوالے کر دیا۔ جب تک گلوریا خط پڑھتی رہی کاؤنٹ کارلائل بے چینی اور سراسیمگی کے عالم میں بار بار اپنا نچلا ہونٹ کاٹتے رہے۔

کاؤنٹ کارلائل کے ذہین ترین شاگردوں میں ڈاکٹر والٹ کا نام سرفہرست آتا تھا۔ وہ ایک بیحد ذہین طالب علم تھا جس نے اپنے زمانے میں گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ یہ بات واقعی بڑی عجیب سی تھی کہ شہری زندگی میں رہ کر بھی اس نے سپیشلسٹ بن کر روپیہ بٹورنے کی بجائے دور دراز دیہاتی علاقوں میں جا کر پریکٹس کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ والٹ کا خیال تھا کہ غریب دیہاتیوں کو علاج کی بہتر سہولتیں صرف اسی صورت میں مل سکتی تھیں جب اچھے ڈاکٹر شہری زندگی کو خیرباد کہہ کر ان کی خبرگیری کے لئے دیہات میں سکونت اختیار کر لیں۔

کاؤنٹ کارلائل حیران تھے کہ دیہات میں دو برس گزارنے کے بعد والٹ کی ذہانت کیوں جواب دے گئی تھی جو اس نے اس قدر غیرواضح اور مبہم سا خط انہیں لکھا۔ اس خط کی بے سروپا باتوں نے انہیں بری طرح الجھا کر رکھ دیا۔ گلوریا بھی اس صورتحال سے خاصی پریشان نظر آتی تھی۔ اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر خود بھی بری طرح بیمار ہے۔"

"یقیناً"۔" کاؤنٹ کارلائل نے اس کی تائید کی۔ "لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر میں کیا کروں۔ میں کس طرح اس کی مدد کر سکتا ہوں۔ مجھے رہ رہ کر اس بیچاری ماریا کا خیال بری طرح ستا رہا ہے۔"

گلوریا نے کہا۔ "خدا جانے وہ کس حال میں ہو گی؟"

کاؤنٹ کارلائل نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "ظاہر ہے اگر والٹ اس قدر پریشان ہے تو ماریا بھی ضرور پریشان ہو گی۔"

لیکن ان سب باتوں کے باوجود ابھی تک کاؤنٹ کارلائل کے دل و دماغ پر سکاٹ لینڈ کے مناظر بری طرح چھائے ہوئے تھے اور وہ اب بھی اپنی تفریح کے پروگراموں سے دستبردار ہونے پر تیار نہیں تھے لیکن گلوریا نے اس قدر اصرار کیا کہ انہیں ہتھیار ڈالتے ہی بن پڑی۔ انہیں ایسے لگا جیسے گلوریا کی آنکھوں نے انہیں مسحور کر لیا ہو اور وہ بے بس ہو کر رہ گئے ہوں۔

☆○☆

کاؤنٹ کارلائل نے فیصلہ کیا کہ وہ ٹارلٹن کا سفر ریل کی بجائے بگھی سے کریں گے۔ اس لئے انہوں نے ایک بگھی کرائے پر حاصل کی اور ٹارلٹن کی طرف چل دیئے۔ راستے میں گلوریا قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے وہ یکایک چیخی۔ "ڈیڈی۔ وہ دیکھیے۔ وہ ایک خوبصورت لومڑی کس تیزی سے بھاگتی چلی جا رہی ہے۔"

"ہاں۔" کاؤنٹ کارلائل نے بے نیازی سے کہا۔ "میری بچی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ لومڑی ان لومڑیوں سے قطعی مختلف نہیں جو میں اب تک دیکھ چکا ہوں۔"

گلوریا نے منہ بسور لیا۔ اسے جانوروں سے ہمیشہ بڑی دلچسپی اور ہمدردی رہی تھی۔ یکایک باہر زور زور سے کسی کے چیخنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ گلوریا نے کھڑکی سے جھانکا تو اس نے دیکھا کہ کچھ نوجوان شکاری تنومند گھوڑوں پر سوار بگھی کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ شکاری کتوں کی ایک ٹولی بھی سڑک کے کنارے جمع ہو گئی تھی۔

یکایک ایک کرخت آواز ابھری۔ "کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟"

"کسے جناب؟" بگھی والے کی آواز متحیر تھی۔

"احمق۔ کیا تم نے یہاں کسی لومڑی کو تو نہیں دیکھا۔" نوجوان شکاری نے کوچوان کی طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس اثنا میں گلوریا نے کوچ کی کھڑکی

سے جھانک کر اس خوبرو نوجوان شکاری کی طرف دیکھا اور بولی۔ "میں نے اسے دیکھا ہے۔ تم جس لومڑی کے بارے میں پوچھ رہے ہو وہ اس طرف' وہاں اس وادی کی طرف گئی ہے۔ اگر تم اسے پکڑنا چاہتے ہو تو جلدی کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم اسے پکڑ نہ سکو۔"

نوجوان نے ایک پرجوش قہقہ لگایا۔ "تم فکر نہ کرو ڈیئر لیڈی۔ ہم اسے ضرور پکڑ لیں گے۔" اس نے چابک ہوا میں لہرایا۔ اس کا گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا اور اس کے تعاقب میں دوسرے شکاری اور ان کے شکاری کتے بھی تیر کی مانند زن سے چل دیئے۔

کاؤنٹ کارلائل نے مشکوک انداز میں گلوریا کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے گلوریا کہ تم نے انہیں صحیح راستہ نہیں بتایا۔"

"ڈیڈی۔ آپ کا خیال بالکل صحیح ہے۔" گلوریا نے ان کی تائید کی۔

کاؤنٹ کارلائل مسکرائے اور بولے۔ "چلو کم از کم وہ لومڑی تو تمہاری ممنون ہو گی ناں۔ خدا کرے اب اس شکاری سے ہمارا ٹکراؤ نہ ہو۔"

پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ کارنوال کے اس گاؤں کے نزدیک پہنچ گئے۔ سامنے سے آتے ہوئے جنازے نے جیسے ان کا راستہ روک لیا۔ چھ آدمی تابوت اٹھائے آہستہ آہستہ چرچ یارڈ کی طرف سر جھکائے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ گاؤں کا پادری ان کی رہبری کر رہا تھا۔ فضا میں عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور کافور کی تیز بو ہوا میں تیر رہی تھی۔ یکایک اس خاموشی میں گھوڑوں کی تیز ٹاپوں کی آوازیں ابھرنی شروع ہو گئیں۔ شکاری قریب آ رہے تھے۔ وہ لوگ سڑک کے کنارے آ کر رک گئے۔ پھر اسی نوجوان نے جسے گلوریا نے غلط پتا بتایا تھا' بگھی کی کھڑکی کے قریب آ کر جھانکا اور چبھتی ہوئی تیز آواز میں بولا۔

"خوب یہ بھی ایک ہی رہی۔" اس کے چہرے پر شیطانیت اور خباثت کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔ "لومڑی اس طرف گئی تھی۔ میرا خیال ہے تمہیں بھی اسی طرف جانا چاہیے۔ کیوں ٹھیک ہے ناں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا چابک لہرایا اور بگھی میں جتے ہوئے گھوڑوں پر برسانا

شروع کر دیا۔ بگھی تیزی سے سامنے سے آتے ہوئے جنازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جنازے میں شریک لوگوں میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ ان لوگوں نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی لیکن اس افراتفری میں ان کا توازن قائم نہ رہ سکا اور تابوت سڑک کے کنارے زمین پر جا گرا۔

لکڑی کا تابوت ایک بھاری آواز سے گرا اور ایک مسخ شدہ لاش لڑھک کر سڑک کے کنارے جا گری۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں جیسے وہ آسمانوں اور خلاؤں میں کچھ تلاش کر رہی ہوں۔ کوچوان نے گھوڑوں پر قابو پا لیا تھا۔ کاؤنٹ کارلائل سخت غیض و غضب کے عالم میں بگھی سے اترے جبکہ شکاری نوجوان استہزائیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

یکایک اس بھیڑ کو چیرتا ہوا ایک آدمی اور آگے بڑھا۔ اس کا چہرہ زرد اور بری طرح ستا ہوا تھا جیسے اس کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہ رہا ہو۔ اس کے اور لاش کے چہرے میں بے حد مشابہت تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور چاہتا ہی تھا کہ اس نوجوان کو اس کی گستاخی کی سزا دے کہ اچانک پادری نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "نہیں مارٹی نہیں۔"

کاؤنٹ کارلائل نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم الو کے پٹھے۔ آخر اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟"

نوجوان نے بے اعتنائی سے کندھے اچکائے۔ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور پھر یہ لوگ قہقہے لگاتے اپنے گھوڑے بھگاتے چلے گئے۔

چوڑے چکلے شانوں والا مارٹی آگے بڑھا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر لاش کو دوبارہ تابوت میں رکھوانے لگا۔ گلوریا بھی بگھی سے اتر آئی اور ان سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن سب لوگوں کے چہروں پر سرد مہری اور غم و غصہ کے تاثرات دیکھ کر اسے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ کاؤنٹ کارلائل نے کہا۔ "مجھے آپ لوگوں کے جذبات کا پوری طرح احساس ہے لیکن آپ لوگوں نے خود دیکھا ہو گا کہ یہ افسوسناک حادثہ ہماری وجہ سے نہیں ہوا۔"

مارٹی نے ایک بار پھر نفرت سے کاؤنٹ کارلائل اور گلوریا کی طرف دیکھا اور

غرایا۔ "میں کہتا ہوں چلے جاؤ یہاں سے۔ ہمیں تنہا چھوڑ دو۔" پھر مارٹی نے دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر تابوت اٹھایا اور چرچ یارڈ کی طرف چل دیا۔

پادری نے کاؤنٹ کارلائل کے قریب آ کر سرگوشی کی۔ "خیال نہ کیجئے گا۔ یہ بات ویسے بھی کسی المیے یا سانحے سے کم نہیں۔ مرنے والا اس کا بھائی تھا۔ اس لئے وہ اس قدر تلخی سے پیش آیا ہے۔ کیا میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں؟"

کاؤنٹ کارلائل نے اسے بتایا۔ "آپ ہمیں ڈاکٹر اور مسز والٹ کا گھر بتا دیجئے۔"

پادری نے چوک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "نوجوان والٹ کا مکان وہ سامنے ہے۔ وہی مکان جس پر لوہے کی جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ آپ آخری بار اس سے کب ملے تھے؟"

کاؤنٹ کارلائل نے کہا۔ "دو برس پہلے۔"

اس پر پادری نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہا۔ "بخدا۔ اب آپ اسے بمشکل پہچان سکیں گے۔ بستی میں ہونے والی ہولناک اموات کی بھیانک تعداد نے ڈاکٹر والٹ کی تو دنیا ہی بدل کر رکھ دی ہے۔" یہ کہہ کر پادری نے جنازے کے آگے اپنی جگہ سنبھالی اور وہ سب لوگ تھکے تھکے بوجھل قدموں سے چرچ یارڈ کی طرف چل پڑے۔

☆○☆

ڈاکٹر والٹ کے چھوٹے سے مکان کا دروازہ بے رنگ و روغن تھا۔ کھڑکیاں بڑی مضبوطی سے بند کی گئی تھیں۔ کھڑکیوں کے قریب جمی ہوئی مٹی کو دیکھ کر کاؤنٹ کارلائل کو بالکل یقین نہیں آیا کہ وہ ماریا جیسی نفاست پسند اور سلیقہ شعار لڑکی کے گھر کے سامنے کھڑے ہیں۔ ہر چیز پر ایک ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ کوچوان نے صدر دروازے پر دستک دی اور پھر انتظار کرنے لگا۔ اس نے پھر دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس بار دروازہ ہلا ضرور لیکن اندر سے کوئی باہر نہیں آیا۔

کوچوان نے کاؤنٹ کارلائل کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ "اب کیا کروں؟"

کاؤنٹ کارلائل کے کہنے پر اس نے ایک بار پھر دستک دی۔ دروازہ اس بار

سختی سے پیٹا گیا۔ ایک ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا بلکہ نیم وا ہوا۔ دروازے کی دراڑ سے کاؤنٹ کارلائل نے ایک دبلی پتلی' زردرو اور بیمار سی عورت کو دیکھا جو اندر نیم تاریکی میں کھڑی تھی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھے۔ عورت نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "ڈاکٹر صاحب گھر پر نہیں ہیں۔"

عورت کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ وہ دروازہ بند کرنا ہی چاہتی تھی کہ گلوریا نے غیریقینی انداز میں تقریباً" چیختے ہوئے کہا۔ "ماریا۔"

"کون ہے؟" ماریا کی آواز جیسے دور کسی کنویں میں سے آ رہی تھی۔

گلوریا نے پھر پوچھا۔ "ماریا۔ کیا یہ تم ہو؟" اس بار دروازہ پوری طرح کھل گیا۔

جونہی باہر کی تیز روشنی ماریا کے چہرے پر پڑی کاؤنٹ کارلائل ششدر رہ گئے۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ پریشان حال اور وحشت زدہ عورت وہی ماریا ہے جو ان کی بیٹی گلوریا کی سب سے زیادہ دلکش' زندگی سے بھرپور' پرجوش اور شاندار سہیلی تھی۔ دونوں لڑکیاں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ خوشی کے مارے ماریا کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اس نے کاؤنٹ کارلائل کو اندر آنے کی دعوت دی۔

"ماریا۔ مجھے تم سے دوبارہ مل کر بے حد مسرت ہوئی۔" کاؤنٹ کارلائل نے کہا۔

مکان بے حد مختصر تھا۔ کاؤنٹ کارلائل مصر تھے کہ وہ اور گلوریا گاؤں کی سرائے میں ٹھہریں گے لیکن شب باشی کے علاوہ اپنا زیادہ تر وقت والٹ اور ماریا کے ہمراہ گزاریں گے۔ کاؤنٹ کارلائل نے محسوس کیا کہ تمام مکان پر عجیب سی ویرانی اور وحشت برس رہی تھی۔ ہر چیز اس طرح گرد آلود تھی جیسے اسے برسوں سے صاف ہی نہ کیا گیا ہو۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ گلدانوں کے پھول جانے کتنے مہینوں سے مرجھا چکے تھے۔ ایک دردناک سی بے کیفی اور مردنی کا احساس دل کو پژمردہ کئے دیتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ماریا کے گالوں کے گلاب بھی گلدان کے گلابوں کی طرح مرجھا کر زرد ہو چکے تھے۔

کاؤنٹ کارلائل اس بات کو اچھی طرح بھانپ چکے تھے کہ پورے مکان پر بے حد ویرانی اور وحشت کا راج ہے۔ ہر چیز سے بے زاری اور بے نیازی ٹپک رہی تھی۔ یکایک ان کی نظر ماریا کی کلائی پر پڑی ہوئی پٹی پر پڑی اور وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکے۔

"ماریا یہ سب کیا ہے؟ کیا تمہیں چوٹ لگی ہے؟"

ماریا نے ان کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے اسے ایک معمولی زخم قرار دیا اور کاؤنٹ کارلائل کو یوں لگا جیسے وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ انہوں نے اصرار کیا کہ وہ ایک نظر ماریا کے زخم کو دیکھنا چاہتے ہیں لیکن ماریا نے یہ کہہ کر ان کی تجویز مسترد کر دی کہ والٹ یعنی اس کا شوہر ایک اچھا ڈاکٹر ہے۔ کاؤنٹ کارلائل نے خشک لہجے میں ماریا کی تائید کی اور بولے۔

"ہاں۔ سنا تو میں نے بھی یہی ہے۔" ان کی آواز میں طنز کا عنصر جھلک رہا تھا۔

گلوریا نے اپنے والد کو روکا اور بولی۔

"چھوڑیئے بھی ڈیڈی۔ اس تذکرے سے کوئی فائدہ۔ نہیں ذرا میں ایک نظر بھر کر پھر اپنی ماریا کو تو دیکھ لوں۔" پھر وہ بھرپور نگاہوں سے ماریا کا جائزہ لینے لگی۔

ماریا کے زرد گالوں پر سرخی کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ بے ساختہ اس کا ہاتھ الجھے ہوئے بالوں سے کھیلنے لگا۔ وہ بولی۔ "آپ لوگ اتنے غیرمتوقع طور پر آ گئے کہ میں تیار بھی نہ ہو سکی۔"

کاؤنٹ کارلائل یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکے کہ اس لڑکی کو بے حد توجہ اور تیمارداری کی اشد ضرورت ہے۔ ان کا خیال تھا کہ گاؤں کی پرفضا آب و ہوا میں تندرستی مضمر ہوتی ہے لیکن ماریا تو برسوں کی بیمار نظر آتی تھی۔

کوچوان نے سامان اتار کر صدر دروازے کے باہر کمپاؤنڈ میں رکھ دیا تھا۔ کاؤنٹ کارلائل اب بھی کسی ہوٹل یا سرائے میں قیام کرنے پر مصر تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ماریا کا مکان بے حد مختصر ہے اور اتنے چھوٹے سے مکان میں دو مہمانوں کی گنجائش میزبانوں کے لئے خاصا دردسر بن سکتی ہے۔ لیکن گلوریا کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ اس نے ان حالات میں ماریا کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے

ماریا کا بازو تھاما اور اسے کشاں کشاں مکان کے اندر لے گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ جلد از جلد مکان کی صفائی کر ڈالے اور تمام کمروں کو ایک نئی صورت دے سکے۔ اس کا دل گھر کی حالت اور گندگی کو دیکھ کر بری طرح متلا رہا تھا۔ کاؤنٹ کارلائل اپنی بیٹی کی رائے سے اختلاف نہ کر سکے۔ وہ خود بھی یہی سوچ رہے تھے کہ انہیں بہرحال والٹ اور ماریا کے ہاں ہی قیام کرنا چاہیے۔

گلوریا اندر کمرے میں ماریا کا ہاتھ بٹا رہی تھی اور اسے خوش کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ کاؤنٹ کارلائل نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر انہوں نے باہر صدر دروازے پر منتظر کوچوان کو کرائے کی ادائیگی کر کے رخصت کر دیا۔

کاؤنٹ کارلائل سوچ رہے تھے کہ غالباً" جب ڈاکٹر اور اس کی بیوی نئے نئے اس مکان میں آئے ہوں گے تو وہ اسے بے حد صاف ستھرا اور خوبصورت بنائے رکھتے ہوں گے۔ اس وقت بھی جبکہ گلوریا گھر کی صفائی کرنے پر تلی ہوئی تھی انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے ماریا کے احتجاج کے باوجود بھی گلوریا اپنے کام میں بڑی جانفشانی اور تندہی سے مگن ہے اور مکان کے ہر گوشے کو جھاڑ پونچھ کر صاف کر رہی ہے۔ چند لمحوں بعد گلوریا چائے کی ٹرے سنبھالتی کمرے میں داخل ہوئی اور کاؤنٹ کارلائل کو چائے کی تیز مہک نے مسحور کر دیا۔ ماریا' گلوریا کی رفتار کو دیکھ کر خاصی خفیف سی نظر آ رہی تھی۔ کاؤنٹ کارلائل نے باتوں کا موضوع بدلنے کی خاطر ماریا سے ڈاکٹر کے بارے میں پوچھا۔ ماریا کے چہرے پر خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا۔

"وہ اپنے راؤنڈ پر ہوں گے۔"

کاؤنٹ کارلائل کو اس کے لہجے کی بے یقینی سے وحشت سی ہو رہی تھی۔ "کیا یہاں مریض بہت زیادہ ہوتے ہیں؟" انہوں نے پھر پوچھا۔

"نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ہاں کچھ دنوں سے لوگ یہاں پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔" ماریا نے دل کی بات کہہ دی۔

ابھی وہ لوگ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ کچن میں گیس جلنے کی تیز بو نے ماریا کو مزید سوالات سے نجات دلا دی۔ وہ اندر کی طرف لپکی اور گلوریا بھی اس کے

پیچھے اندر چلی گئی۔ کاؤنٹ کارلائل نے صدر دروازے کا رخ کیا اور چوک کے قریب بار کی طرف دیکھنے میں محو ہو گئے۔

گاؤں میں اکثر مکانات بڑے خوبصورت فن تعمیر کا نمونہ تھے اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ ایک خوبصورت گاؤں تھا لیکن جانے کیوں گاؤں کے درودیوار پر حزن و ملال کی کیفیت سی طاری تھی اور فضا میں سوگواری رچی ہوئی تھی۔ کاؤنٹ کارلائل نے دیکھا کہ چرچ یارڈ کی طرف سے تابوت کو دفن کرنے کے بعد لوگوں کا ایک گروہ بار کی طرف جا رہا تھا۔ وہ لوگ آہستہ آہستہ سر جھکائے بار کی طرف بڑھے اور پھر ایک ایک کر کے سب بار میں غائب ہو گئے۔ کاؤنٹ کارلائل نے سڑک پار کی اور تیزی سے بار میں داخل ہو گئے۔

اندر کا ماحول باہر کی نسبت خاصا خنک تھا۔ کاؤنٹ کارلائل نے مارٹی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "مارٹی۔ کیا تم کچھ پینا پسند کرو گے؟"

مارٹی نے نخوت سے کندھے اچکائے اور بولا۔ "جی نہیں۔ شکریہ۔ میں اپنے لئے خود شراب خریدوں گا۔ ٹام' ہمارے لئے۔ میرا مطلب ہے سب کے لئے بیئر کے گلاس تیار کر دو۔"

اسی دوران لوگوں کے ہجوم سے کسی کی بے بس اور مایوس آواز ابھری۔ "میں نے اپنی پوری کوشش کی۔ بخدا مجھے بے حد دکھ ہے۔ بے حد افسوس ہے کہ میں اسے نہیں بچا سکا۔"

کاؤنٹ کارلائل نے چشم زدن میں اس لہجے کو پہچان لیا۔ یہ وہی لہجہ تھا جس کی بازگشت وہ گزشتہ روز والٹ کے خط میں سن اور پڑھ چکے تھے۔ بار کے مالک نے اپنے دونوں ہاتھوں میں شیمپئن کے دو گلاس اٹھائے اور بڑے دھیمے لہجے میں والٹ سے بولا۔ "ڈاکٹر۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ اس کی موت کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟"

"ہونہہ۔ موت کا سبب۔" مارٹی غرایا۔ "اس کی موت کا سبب یا ان کی موت کا سبب جو اس سے پہلے مر چکے ہیں۔"

والٹ نے اپنا گلاس اٹھایا اور اسے ایک ہی سانس میں خالی کرتے ہوئے بولا۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"تمہیں کچھ معلوم نہیں اور تم خود کو ڈاکٹر کہلواتے ہو۔" مجمع میں سے ایک طنزیہ آواز ابھری۔

"ہاں۔ میں کہتا ہوں مجھے کچھ معلوم نہیں۔" والٹ ہذیانی انداز میں چیخا۔ "کاش تم لوگوں نے اب تک مجھے ایک بھی لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے کی اجازت دے دی ہوتی تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔"

ایک آدمی آگے بڑھا اور بولا۔ "فضول ہے۔ یہ ایک احمقانہ فعل ہے۔ پوسٹ مارٹم سے مردے کے لواحقین کو اذیت دینے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔"

ڈاکٹر والٹ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ "تم سب لوگ ذلیل اور کمینے ہو۔"

مارٹی اپنی جگہ سے اٹھ کر والٹ کے قریب چلا گیا اور چیخ کر بولا۔ "وہاں اس قبرستان میں میرا بھائی اور بارہ دوسرے آدمی مرے پڑے ہیں۔ ہر مہینے ایک آدمی مرجاتا ہے۔ ایک سال میں بارہ اموات --- اور تم کہتے ہو کہ تمہارا ریکارڈ اچھا ہے۔ تم آخر اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟ ہم باز آئے ایسے مسیحا سے۔"

بار کے مالک نے والٹ کے جام میں اور وہسکی انڈیلی اور والٹ نے غصے سے کہا۔ "تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو۔ کیا میرے یہاں آنے سے قبل کسی شخص کی موت نہیں ہوئی؟ کیا ان سب اموات کا ذمہ دار میں ہوں؟ میں ڈاکٹر ہوں۔ موت کا سوداگر نہیں۔"

"یہ درست ہے۔" مارٹی نے غصے سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ "لیکن ہمیں کم از کم ان کی موت کا سبب تو معلوم ہو جاتا تھا۔"

والٹ نے مارٹی کی طرف توجہ دیئے بغیر کہا۔ "تم لوگ آخر چاہتے کیا ہو؟ اگر میں جھوٹ بولوں' تم لوگوں سے کہوں کہ یہ لوگ جو مرے ہیں' طاعون' دلدلی بخار یا کسی اور بیماری سے مرگئے ہیں تو یہ ٹھیک ہو گا؟ میں آخر تم لوگوں کو کب تک جھوٹے دلاسے دے سکوں گا۔ کب تک اپنے آپ کو خود فریبی میں مبتلا رکھ سکتا ہوں؟"

معاملہ اب خاصا طول پکڑ گیا تھا۔ اس مرحلے پر کاؤنٹ کارلائل نے مداخلت کرنا مناسب سمجھا۔ وہ آگے بڑھے اور زور سے کہا۔ "اخاہ۔ ڈاکٹر تم یہاں ہو اور ہم تمہیں پورے گاؤں میں تلاش کر آئے۔"

والٹ نے پلکیں جھپکائیں اور بے یقینی کے عالم میں کاؤنٹ کارلائل کو دیکھنے لگا۔ کاؤنٹ کارلائل سمجھ گئے کہ ڈاکٹر نے بہت زیادہ پی لی ہے اسی لئے وہ انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس دوران وہ سب لوگ جن سے تابوت گر جانے پر ڈاکٹر کے مہمان یعنی کاؤنٹ کارلائل کی خاصی جھڑپ ہو چکی تھی کاؤنٹ کارلائل کے گرد جمع ہو گئے۔ ان کے چہروں سے خشونت اور ناراضگی نمایاں تھی۔ کاؤنٹ کارلائل مسکرائے۔ ان سب کو معذرت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور کاؤنٹر پر ایک سونے کا سکہ رکھتے ہوئے بار کے مالک سے کہا کہ وہ ان سب کو کاؤنٹ کارلائل کے حساب میں خوب پلائے۔ پھر وہ ڈاکٹر والٹ کا ہاتھ تھامے بار سے باہر چلے آئے۔

شام کے سائے آہستہ آہستہ گاؤں میں اتر رہے تھے اور کاؤنٹ کارلائل مضبوطی سے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑے اس کے گھر کی طرف رواں تھے۔

"تم بہت کمزور ہو گئے ہو۔ کیا ایلس تمہاری خوراک کا خیال نہیں رکھتی؟" کاؤنٹ کارلائل نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

ڈاکٹر نے ان کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "خدا کے واسطے کاؤنٹ کارلائل۔ مجھے بتایئے آخر آپ یہاں کیا لینے آئے ہیں؟"

"کیوں کیا بات ہے؟ کیا تمہیں مجھے دیکھ کر خوشی نہیں ہوئی؟" کاؤنٹ کارلائل نے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر کوئی جواب دیتا کاؤنٹ کارلائل بولے۔ "بھئی خود تم ہی نے تو خط لکھ کر مجھے بلایا تھا۔"

ڈاکٹر نے بے یقینی سے کاؤنٹ کارلائل کی طرف دیکھا۔ "کس نے؟ میں نے؟ اوہ اچھا۔ خوب یاد آیا۔ ہاں میں نے ہی تو لکھا تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ خط اس قدر مبہم تھا کہ آپ کے کچھ بھی پلے نہیں پڑا ہو گا۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے مکان کے قریب پہنچ گئے۔ کاؤنٹ کارلائل نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "میں نے ماریا کو دیکھا ہے۔ بخدا وہ تو تم سے بھی کہیں

زیادہ کمزور ہو گئی ہے۔ اف میرے خدا۔ وہ کس قدر بدل چکی ہے۔" کاؤنٹ کارلائل کا خیال تھا کہ ڈاکٹر والٹ اور ماریا دونوں کو سخت آرام کی ضرورت ہے۔ انہوں نے دروازہ کھولا اور بولے۔ "میرا خیال ہے کہ رات کے کھانے کے بعد محفل جمے گی اور اس موضوع پر تم سے تفصیلی گفتگو رہے گی کہ آخر تمہیں کیا پریشانی لاحق ہے؟"

ڈاکٹر والٹ نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر چپ ہو گیا کیونکہ وہ کاؤنٹ کارلائل کی اس عادت سے بخوبی واقف تھا کہ وہ بار بار اپنے فیصلوں میں ترمیم نہیں کیا کرتے۔ وہ دونوں اندر چلے آئے راہداری میں لیمپ روشن تھے اور شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں مکان کا اندرونی حصہ اب پہلے سے زیادہ نفیس اور جاذب نظر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ لوگ باتیں کرتے ہوئے کھانے کی میز پر جا بیٹھے۔

کھانا سادہ تھا لیکن بے حد لذیذ تھا۔ کاؤنٹ کارلائل کو یقین ہو چلا تھا کہ ان کی بیٹی گلوریا نے بڑی حد تک اپنی سہیلی ماریا کے دکھ اور کرب میں کمی کر دی ہے۔ کیونکہ اب وہ خاصی پرسکون اور مطمئن نظر آ رہی تھی لیکن دن بھر کے کام کاج کے بعد تھکن کے آثار گلوریا کے چہرے سے ظاہر ہو رہے تھے۔

کچھ دیر بعد تاریکی نے گاؤں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ رات کا سناٹا دبے پاؤں گاؤں کی کچی پکی گلیوں میں اترنے لگا۔ کاؤنٹ کارلائل نے دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھا اور بولے۔ "میرا خیال ہے تم دونوں جاؤ اور جا کر لیٹ رہو۔ میں اور والٹ ابھی کچھ دیر گپ شپ کریں گے۔"

گلوریا کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر اس نے ماریا کا نرم بازو تھاما اور اسے اپنے ہمراہ لئے ہوئے بیڈ روم کی طرف چل پڑی۔ ان کے جانے کے بعد والٹ نے سائیڈ بورڈ سے وہسکی کی ایک بوتل نکالی۔ ایک بڑے سے گلاس میں وہسکی انڈیلی اور پینا ہی چاہتا تھا کہ کاؤنٹ کارلائل کی پروقار اور گھمبیر آواز کمرے میں گونجی۔ "والٹ کیا حالات کا مقابلہ اسی طرح بزدلی سے کیا جاتا ہے؟"

والٹ کے چہرے سے مایوسی اور بیزاری عیاں تھی۔ اس نے گلاس کی وہسکی ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دی اور پھر جام بھرنے لگا۔ کاؤنٹ کارلائل نے والٹ کا

لکھا ہوا خط نکالا اور اسے پڑھتے ہوئے بڑبڑائے۔ "ہوں۔ لوگ یہاں مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ آخر یہ سب کیا ہے؟ میں نے تمہیں کبھی اس قدر مایوس اور الجھی الجھی باتیں کرتے نہیں دیکھا۔" انہوں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "کیا تم نے اس پراسرار بیماری کی علامتیں معلوم کرنے کی کوشش کی۔ آخر تمہارے خیال میں اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

والٹ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کاؤنٹ کارلائل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے بتایا۔ "بظاہر اس بیماری کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ میں نے لوگوں کا اور خصوصاً مریضوں کا خون کا گروپ معلوم کرنا چاہا تو ایسا نہیں کر سکا۔ یہ لوگ بڑے وہمی واقع ہوئے ہیں۔ مرنے والوں نے یہی کہا کہ وہ سوئی کی چبھن بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ ایک بڑی عجیب سی بات ہے۔ لیکن یہاں کے لوگ بے حد توہم پرست ہیں۔ اتنی اموات کے باوجود میں ایک بھی پوسٹ مارٹم نہیں کر سکا۔ یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔ ویسے بھی یہ لندن تو ہے نہیں۔ یہ تو ایک معمولی سا کارنش گاؤں ہے جہاں جاگیردار گاریز کی حکمرانی ہے۔ وہ جو بھی کرتا ہے محض اپنے مفاد اور خوشی کی خاطر کرتا ہے۔ اسے گاؤں کی خوشحالی' ترقی یا سیاسی ترقی سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

کاؤنٹ کارلائل نے افسوس سے سر ہلایا۔ انہیں یہ احساس ہونے لگا کہ رات اب بہت بیت چکی ہے اس لئے سو رہنا ہی بہتر ہو گا۔ والٹ بڑی امید بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کاؤنٹ کارلائل نے ایک بار پھر ذہن سے نیند کو جھٹکا اور قطعی فیصلہ سناتے ہوئے بولے۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہمیں پوسٹ مارٹم کے لئے ایک لاش ہر قیمت پر حاصل کرنا ہو گی اور اس سلسلے میں مارٹی کے بھائی کی لاش جو ابھی حال ہی میں مرا ہے زیادہ مناسب رہے گی۔ اب ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔ زیادہ وقت ضائع نہیں کر سکتے۔ ہمیں جلد از جلد یہ اقدام کرنا ہو گا۔"

والٹ بڑے غیر یقینی انداز میں کاؤنٹ کارلائل کو دیکھے جا رہا تھا۔ وہ پھر بولے۔ "آج رات چودھویں کی رات ہے۔ اس سے بہتر موقعہ ہمیں پھر نہیں مل

سکے گا۔ ہمیں آج رات ہی یہ لاش حاصل کرنا ہوگی۔ تمہارا کیا خیال ہے کوئی حرج تو نہیں ہوگا؟"

والٹ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن پھر اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

"خوب۔" کاؤنٹ کارلائل نے مطمئن انداز میں کہا۔ "اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے اس پوسٹ مارٹم سے کیا نتائج ظاہر ہوں گے۔"

اس گفتگو کے بعد وہ دونوں اوپر بیڈ روم میں چلے آئے اور کچھ دیر تک وہاں بیٹھنے کے بعد یہ سوچ کر کہ وہ لڑکیوں کی تنہائی میں مخل ہو رہے ہیں' پھر نیچے ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔

ان دونوں کے جاتے ہی ماریا کسمسانے لگی اور گلوریا اس کے بستر پر آ بیٹھی۔ دونوں سہیلیاں دھیمی دھیمی آوازوں میں باتیں کرنے لگیں۔ گلوریا نے محسوس کیا کہ ماریا کی ہنسی میں شادابی اور تازگی عنقا تھی۔ اس کی مسکراہٹ بھی بڑی پژمردہ اور اداس تھی۔ اس نے ماریا سے صبح کے واقعے کا تذکرہ بھی کیا اور بتایا کہ وہ اب تک ان گھڑسواروں کی ہوسناک نگاہوں کو نہیں بھلا سکی ہے۔ ماریا نے کہا۔

"ہاں۔ وہ لوگ یقیناً" براؤن گاریز کے دوست ہی ہو سکتے ہیں۔"

گلوریا کے استفسار پر ماریا نے بتایا کہ گاریز ایک بے حد وجیہہ اور امیر آدمی ہے۔ وہ ابھی تک کنوارا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اکثر لڑکیاں اس کی دیوانی ہیں۔

گلوریا کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی اور وہ بولی۔ "غالباً" تم میرے ساتھ دل لگی کرنے کے موڈ میں ہو۔ بہرحال میری جان تم اپنی کہو۔ تمہارا کیا حال ہے؟"

یہ سن کر ماریا کے چہرے پر یکایک درشتی چھا گئی اور گلوریا کو احساس ہوا کہ اسے یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ لیکن وہ سوچ رہی تھی۔ کہیں ڈاکٹر والٹ اور ماریا کے درمیان یہ تیسرا آدمی تو اختلاف کا سبب نہیں بن گیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد گلوریا کھوکھلی سی ہنسی ہنسنے لگی اور گلوریا کو اس طرح ہنستے دیکھ کر ماریا بھی اس کا ساتھ دینے لگی۔ اب وہ دونوں گزرے ہوئے دنوں کی باتیں کر رہی تھیں اور رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی۔

گلوریا کو یقین تھا کہ والٹ' براؤن گاریز کو ہرگز پسند نہیں کرتا ہوگا۔ پھر اس

نے اپنا سامان سلیقے سے رکھا اور اپنے آرام دہ بستر کا رخ کیا۔ وہ سوچ رہی تھی کل صبح اسے اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔ خدا معلوم ماریا اس قدر بدسلیقہ اور پھوہڑ کب سے ہو گئی تھی کہ اسے نہ اپنا کچھ ہوش تھا اور نہ گھر کی خبر۔ گلوریا نے اپنا شب خوابی کا لباس پہنا اور خوشبوؤں سے مہکتے ہوئے بستر میں لیٹ گئی۔ نیچے کمرے سے ابھی تک کاؤنٹ کارلائل اور والٹ کی باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

بستر میں لیٹتے ہی لیونڈر کی بھینی بھینی خوشبو اور فاختہ کے پروں کی مانند نرم بستر کے پرسکون آرام نے گلوریا کو تھپکنا شروع کر دیا۔ وہ بستر سے اٹھی اور آہستہ سے پھونک مار کر موم بتی گل کر دی۔ پھر اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ باہر دور تک ویرانی اور سناٹے کا راج تھا۔ چوک میں مکمل خاموشی تھی۔ ہر طرف ایک ہو کا عالم طاری تھا۔ آسمان پر چھوٹے چھوٹے سیاہ اور بھورے بادلوں کے ٹکڑے ہوا میں تیر رہے تھے اور چاند کی زرد چاندنی ہر طرف بکھری ہوئی تھی۔

گلوریا کو ہمیشہ سے ہی گاؤں کی پرسکون زندگی سے عشق تھا اور وہ ہمیشہ ایسے ماحول کی متلاشی رہتی تھی۔ چاند کی روشنی میں یکایک اس کی نظر باہر ایک سائے پر پڑی۔ یہ یقیناً" ماریا تھی جو مکان سے دبے پاؤں نکل کر باہر جا رہی تھی۔

"ماریا۔" گلوریا نے آواز دی۔ لیکن اس کی آواز پر توجہ دیئے بغیر ماریا آگے بڑھتی رہی۔

گلوریا قدرے جھجکی۔ پھر اس نے تیزی سے اپنا نائٹ گاؤن پہنا اور جلدی جلدی سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے راہداری میں چلی آئی۔ اندر ڈرائنگ روم میں کاؤنٹ کارلائل اور والٹ محو خواب تھے۔ اس نے انہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا اور تنہا ماریا کے تعاقب میں چل پڑی۔ اس نے باہر نکلنے کے لئے کچن کا عقبی دروازہ ہی استعمال کیا۔

ماریا غائب ہو چکی تھی۔ آخری بار گلوریا نے اسے ایک تنگ سی گلی کے موڑ پر مڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ گلوریا نے دوڑ کر چوک پار کیا اور گلی میں داخل ہو گئی۔ گلی کے دونوں اطراف مکان خاموش کھڑے تھے۔ گلی کے آخر میں پہنچ کر گلوریا رک گئی۔ یہاں اس نے دیکھا کہ ماریا تیز تیز قدم اٹھاتی جھاڑیوں کی طرف چلی جا

رہی ہے۔ گلوریا نے تیزی سے ماریا کا تعاقب کرنا شروع کر دیا۔ وہ اب اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ کچھ دور جا کر درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں ماریا غائب ہو گئی اور گلوریا حیران پریشان اس ویرانے میں کھڑی رہ گئی۔

سامنے ہر طرف دور دور تک سنسان کھیت نظر آ رہے تھے اور ان پر وحشت برس رہی تھی۔ یکایک اس کو خوف سے جھرجھری سی آ گئی۔ گاؤں بہت دور رہ گیا تھا۔ وہ اس ویرانے میں اکیلی کھڑی تھی اور راستہ بھول چکی تھی۔

چاند کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا قطعی ناممکن تھا کہ ماریا کس طرف گئی ہو گی؟ گلوریا کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔ لیکن اس نے پھر اپنی ہمت یکجا کی اور تیزی سے آگے کی طرف چل دی۔ رات کے اس ہولناک سناٹے میں اس نے آواز دی۔ "ماریا۔" اور پھر اسے احساس ہوا کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس ویرانے میں دور کسی الو کی کرخت اور دلخراش چیخ نے گلوریا کا دل دہلا دیا اور گلوریا کے قریب ہی ایک گھنی جھاڑی سے ایک سایہ سا نمودار ہوا۔

چاند کی روشنی میں گلوریا نے دیکھا کہ یہ مارٹی تھا۔ شراب کے نشے میں دھت اور بدمست۔ مارٹی نے فوراً گلوریا کو دیکھ لیا اور اپنے بازو وا کئے وہ اسے اپنی گرفت میں لینے کے لئے آگے بڑھنے لگا۔ درختوں کی خشک ٹہنیاں، سوکھے پتے اور گھاس پھونس اس کے بوجھل قدموں کے نیچے چرمرا رہے تھے۔ گلوریا تیزی سے مڑی اور دوڑنے لگی۔ اس کے سامنے وسیع سبزہ زار تاحد نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ اس کے دماغ میں بس ایک ہی دھن تھی کہ وہ کسی طرح جلد از جلد گاؤں واپس پہنچ سکے۔

وہ بے تحاشا بھاگ رہی تھی۔ لیکن اس افراتفری میں اسے صحیح راستہ یاد نہیں رہا تھا۔ وہ چند لمحے کے لئے رکی اور تب اس نے دیکھا کہ تین آدمی گھوڑوں پر سوار وادی کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کے جسمانی خطوط اب چاند کی روشنی میں واضح ہوتے جا رہے تھے اور ان کی وحشت انگیز ہنسی اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ اب وحشت، درندگی اور بربریت کا ایک نیا کھیل شروع ہونے کو

ہے۔

گلوریا تن تنہا میدان کے بیچ میں چاندنی میں نہائی کھڑی تھی۔ اسے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اس کی حالت اس وقت اس لومڑی سے قطعی مختلف نہیں ہے جس کی جان کے درپے شکاری اور شکاری کتے ہوا کرتے ہیں۔ اس کے چاروں طرف کھلا میدان تھا لیکن فرار کی سب راہیں مسدود تھیں۔

جونہی گلوریا ایک طرف کو دوڑی، ایک گھڑسوار تیزی سے اس طرف آ گیا اور جب وہ پلٹ کر دوسری سمت میں لپکی تو وہاں اس نے دوسرے کو پہلے ہی موجود پایا۔ وہ لوگ ہذیانی انداز میں چیخ رہے تھے اور ان کے چہروں سے سفاکی اور درندگی عیاں تھی۔ وہ سب اس کھیل سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ گلوریا نے اس بار پلٹ کر جنگل کا رخ کیا۔ اب وہ تینوں تیزی سے اپنے گھوڑے دوڑاتے اور چابک لہراتے اس کے تعاقب میں چل پڑے۔ جنگل میں درختوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ اس لئے گلوریا کے لئے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں تھی اور فرار کا راستہ بھی قطعی بند تھا۔ شکاری اپنے شکار کو دبوچ لینے کے لئے برسرپیکار تھے۔ یہ سب کچھ ایک بھیانک خواب سے کسی صورت کم نہیں تھا۔

گلوریا سانس لینے کے لئے رکی۔ اس کا دل چاہا کہ اپنا گریبان چاک کر ڈالے۔ اپنی ریشمی زلفوں میں خاک ڈال لے اور چیخ چیخ کر رونے لگے۔ اس ایک لمحے میں وہ تینوں اس کے قریب آ رہے تھے حتیٰ کہ ان میں سے ایک شخص گھوڑا دوڑاتا ہوا خوشی سے چیختا ہوا گلوریا کے بالکل قریب آ گیا۔ وہ جھکا اور گلوریا کی کمر میں بازو ڈال کر اسے کھینچ کر اوپر اٹھا کر گھوڑے کی کمر پر لاد لیا۔ گھوڑا زور سے ہنہنایا اور پھر سرپٹ کھلے میدان میں دوڑنے لگا۔

گلوریا کے دل و دماغ میں طوفان سا اٹھ رہا تھا۔ یہ بات اس کے لئے قطعی ناقابل برداشت اور ناقابل یقین تھی کہ اس تہذیب یافتہ دور میں بھی چند غنڈے یوں دوسروں کی آبرو سے آزادانہ کھیلتے پھریں اور کھلے بندوں یوں دندناتے پھریں۔ یہ ناممکن تھا۔ لیکن اس وقت یہ ایک تلخ حقیقت کے روپ میں اس کے ساتھ پیش آ رہا تھا۔

اس کا سر زمین کی طرف لٹکا ہوا تھا۔ اس کی دلکش آنکھوں میں خون کے سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ نیچے زمین گھوڑوں کے ٹاپوں تلے تیزی سے گزر رہی تھی اور بجری کی آواز اس کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھی۔ کافی دیر بعد وہ لوگ رک گئے۔ صیاد نے گھوڑے سے اتر کر اس کی کلائی مضبوطی سے جکڑ لی اور اسے بڑے ظالمانہ انداز میں گھسیٹتا ہوا پرانے سالخوردہ صدر دروازے کی طرف لے چلا۔

یہ ایک پرانی سی عمارت تھی۔ عمارت میں شاندار ہال تھا جس میں بڑی بڑی موم بتیوں کی تیز روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

گلوریا ابھی تک بری طرح خوفزدہ تھی لیکن وہ اپنا خوف ان بدطینت اور درندہ صفت شیطانوں پر ہرگز ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ہاں یہ احساس کہ ابھی وہ لوگ اس کے ساتھ زیادتی کرنے والے تھے اس کی رگوں میں خون برف کی طرح منجمد کئے دیتا تھا۔

اسے اغوا کرنے والے آدمی نے اسے فرش پر گرا دیا اور حقارت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ایک ساتھی نے کہا۔ "بیلی۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ ---"

لیکن اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ بیلی نے کہا۔ "اس کا خیال رکھنا اور ہاں دیکھو سگار اور شراب کا انتظام کر لو تاکہ اس دو آتشہ کو سہ آتشہ بنایا جا سکے۔" اس کے لہجے سے رعب اور تحکم عیاں تھا۔

وہ لوگ تعداد میں تین تھے لیکن اب ان میں ایک چوتھے فرد کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے گلوریا کے گرد گھیرا سا ڈال لیا اور غٹاغٹ جام پینے لگے۔ بیلی سگار اور شراب سے لطف اندوز ہونے کے بجائے بالکل الگ تھلگ، خاموش سا نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں ہنٹر تھامے ہوئے بڑی بد خصلتی سے گلوریا کو جنسی اذیت دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

بیلی نے تاش کا ایک پیکٹ اٹھایا اور اسے ہاتھوں پر سنبھالے ان تینوں کے پاس یکے بعد دیگرے گیا۔ سب نے ایک ایک پتا لے لیا۔

گلوریا ہمت کر کے لڑکھڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ بھیانک خواب اب اس کے لئے قابل نفرت اور گھناؤنی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ جلد از جلد یہ خوفناک کھیل ختم ہو جائے۔

بیلی نے اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا پتا دیکھا اور خوشی سے چیخا۔ "وہ مارا۔ حکم کا بادشاہ۔ کس قدر مناسب اور بروقت کام آیا ہے۔"

وہ تینوں بھی اس کے ساتھ مل کر ہذیانی ہنسی ہنسنے لگے اور اپنے تاش کے پتے ادھر ادھر پھینک دیئے۔

"مجھے مت چھونا۔ میرے قریب مت آنا۔" گلوریا کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آواز کہیں دور سے آ رہی ہو۔ کمزور اور ناتواں۔

وہ چاروں پھر ہنسے۔ اس بار ان کی ہنسی میں طنز اور مزاح کے برعکس للچائی ہوئی ہوس کی پھنکار سنائی دے رہی تھی۔

بیلی گلوریا کے قریب آیا۔ اس کے ہاتھ میں دبا ہوا ہنٹر موم بتیوں کی تیز روشنیوں میں لہرایا اور اس نے بڑی نرمی سے کہا۔

"خیریت چاہتی ہو تو چپ چاپ پڑی رہو۔ ورنہ مار مار کر کھال ادھیڑ دوں گا۔ خاموشی میں ہی تمہاری بھلائی ہے۔"

☆○☆

والٹ تیزی سے آگے بڑھا اور جلدی میں اس کا پھاوڑا چرچ یارڈ کے گیٹ سے ٹکرایا۔ "ٹن" --- آواز زیادہ نہیں تھی لیکن رات کے سناٹے میں یہ آواز یوں محسوس ہوئی جیسے دور تک اس کی بازگشت سنائی دے رہی ہو۔

کاؤنٹ کارلائل اور والٹ دبے قدموں آگے بڑھ رہے تھے۔ کاؤنٹ کارلائل نے ہاتھ میں لالٹین اٹھا رکھی تھی۔ چاند نکل آنے پر انہوں نے لالٹین کی لو دھیمی کر دی اور دونوں تازہ بنی ہوئی قبر کے سرہانے پہنچ گئے۔ قبر پر چند مرجھائے ہوئے ننھے ننھے پھول پڑے ہوئے تھے۔ دونوں آدمیوں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر بڑی خاموشی سے اپنے کام میں جت گئے۔ والٹ نے کھودنا شروع کر دیا۔ اس دوران کاؤنٹ کارلائل بار بار گر جا گھر کی سمت جا کر دیکھ لیتے کہ کوئی آ تو نہیں رہا۔

لیکن کسی قسم کی مداخلت کا امکان فی الوقت انہیں نظر نہیں آیا۔

قبر کی زمین ابھی بھربھری تھی۔ جلد ہی تابوت نظر آنے لگا۔ والٹ نے تابوت پر پڑی ہوئی مٹی اور پتھر ہٹائے اور اسکرو ڈرائیور اٹھا کر تابوت کا ڈھکنا کھولنے لگا۔

کاؤنٹ کارلائل کو کسی غیر متوقع نتیجے کا انتظار نہیں تھا۔ لیکن خوف اور تجسس کی ایک سرد لہر والٹ کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ تابوت کی آخری کیل بھی نکال دی گئی۔ والٹ نے سیدھے کھڑے ہو کر سانس لی اور اسکرو ڈرائیور کاؤنٹ کارلائل کے حوالے کر دیا۔

"اب دیکھیں کیا ہوتا ہے؟" کاؤنٹ کارلائل نے کہا۔

"ہاں۔ اب دیکھئے کیا ہوگا؟" کاؤنٹ کارلائل کے پیچھے سے ایک آواز ابھری۔ انہیں جھرجھری سی آگئی۔ وہ سنبھلے اور یہ دیکھنے کے لئے مڑے کہ یہ تیسری آواز کس کی تھی۔

چاند کی روشنی میں کسی کی وردی کے بٹن چمکنے لگے اور والٹ ایک جست لگا کر قبر کے گڑھے سے باہر آگیا۔ یہ سارجنٹ تھا۔ کاؤنٹ کارلائل اور والٹ کے لئے فرار ناممکن تھا۔ وہ دونوں رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ انکار کی گنجائش ہرگز نہیں تھی۔ اس مرحلے پر کاؤنٹ کارلائل نے سارجنٹ سے کہا۔

"اب ہم جبکہ اپنے کام کے آخری مرحلے پر پہنچ چکے ہیں کیا آپ کو اس بات پر کوئی اعتراض ہوگا۔ اگر ہم تابوت کا ڈھکنا اٹھا دیں تو؟"

"یقیناً۔" جواب ملا۔ "مجھے اعتراض ضرور ہوگا۔ خدا کے واسطے مردوں کو ان کی آخری آرام گاہوں میں آرام سے سونے دیجئے۔ اگر آپ میں سے کسی نے تابوت کو ہاتھ لگایا تو۔۔۔"

لیکن کاؤنٹ کارلائل نے پولیس کے آدمی کی بات سنی ان سنی کر دی اور یہ کوشش کرنے لگے کہ اسے باتوں میں الجھائے رکھیں۔ والٹ نے یہ موقع غنیمت جانا اور تیزی سے قبر میں کود کر تابوت کا ڈھکنا ہٹا دیا۔ خوف اور حیرت سے ملی جلی ایک چیخ اس کے حلق سے برآمد ہوئی۔

سارجنٹ اور کاؤنٹ کارلائل تیزی سے قبر کی طرف لپکے۔ خوف اور دہشت

سے ان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ تابوت خالی تھا۔

ان تینوں کے ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے۔ خود کاؤنٹ کارلائل کی حالت کافی خراب ہو چلی تھی۔ ان کی سمجھ میں یہ ناقابل فہم بات نہیں آ رہی تھی کہ آخر لاش کیا ہوئی؟

بہرحال یہ بات طے تھی کہ اب قانون کا ہاتھ ان کے گریبان تک نہیں پہنچ سکتا تھا کیونکہ زیادہ سے زیادہ ان پر لاش چرانے کا الزام عائد کیا جا سکتا تھا۔۔۔ لیکن یہاں تو لاش کا وجود ہی سرے سے نہیں تھا۔ کاؤنٹ کارلائل نے سارجنٹ سے درخواست کی کہ وہ اس پراسرار بیماری کا سراغ لگانے کے لئے ان کی مدد کرے کیونکہ یہ ایک ایسا کام تھا جس میں پورے گاؤں کی فلاح اور بھلائی تھی۔

سارجنٹ نے پہلے تو ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ پھر بولا۔

"کاؤنٹ کارلائل۔ آپ کو شاید یہ نہیں معلوم کہ اس بھیانک بیماری کی بھینٹ چڑھنے والوں میں خود میرا بیٹا سرفہرست آتا ہے۔"

"تمہیں اپنے بچے کی قسم۔ تم ہماری مدد کرو۔ خدا تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے بیٹے کی روح سکون سے سو سکے گی۔" کاؤنٹ کارلائل نے اس کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی جو خاصی کامیاب رہی لیکن والٹ نے محسوس کیا کہ کاؤنٹ کارلائل کی آواز کانپ رہی تھی۔

آخر کار سارجنٹ نے ان کا ساتھ دینے کی حامی بھرلی اور کہا۔ "اچھا کاؤنٹ کارلائل میں آپ کو مزید اڑتالیس گھنٹے کی چھوٹ دینے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن خیال رہے اس بات کی خبر کسی کو نہیں ہونی چاہیے اور ہاں یہاں سے جانے سے پہلے آپ دونوں اس قبر کو بالکل پہلے کی طرح پاٹ دیں تاکہ کسی کو یہ شبہ بھی نہ ہو سکے کہ کسی نے قبر کو چھیڑا ہے یا اسے کھودنے کی کوشش کی ہے۔"

کاؤنٹ کارلائل اور والٹ نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے کام میں مگن ہو گئے۔ جونہی وہ اس کام سے فارغ ہوئے' انہوں نے گھر کا رخ کیا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ دن بھر کی تھکی ماندی گلوریا اور ماریا نیند کی وادیوں میں گم ہو چکی ہوں گی۔

☆○☆

"اسے تنہا چھوڑ دو۔" ہال میں ایک بارعب اور پاٹ دار آواز گونجی۔ بیلی کا آگے بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا اور اس کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید ہو گیا۔ اس کی ہوسناک نگاہیں ابھی تک گلوریا کے آتشیں بدن کے نشیب و فراز میں الجھی ہوئی تھیں۔

سیڑھیوں پر ایک پروقار اور شاندار آدمی کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر شہوت اور ہوس کے سائے رقص کر رہے تھے لیکن وہ ایک وجیہہ انسان تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اس امر کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ ایک ماہر شکاری ہے۔ گلوریا کے دل میں اس کے لئے بھی نفرت کا لاوا ابل پڑا۔

وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرتا نیچے آیا۔ گلوریا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ نووارد بجلی کی سی سرعت کے ساتھ آگے بڑھا اور الٹے ہاتھ کا ایک بھرپور تھپڑ بیلی کے چہرے پر رسید کیا۔ ضرب اس قدر شدید تھی کہ بیلی لڑھکتا ہوا دور فرش پر جا گرا۔ اس کے جبڑے سے خون بہنے لگا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ بلند کیا تاکہ اپنا دفاع کر سکے لیکن اجنبی نے تابڑتوڑ کئی گھونسے رسید کئے۔ بیلی کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور وہ اس خوفناک ٹھکائی سے بچنے کے لئے ناکام کوشش کر رہا تھا۔

"اٹھو اور دفعان ہو جاؤ۔ حرامزادے۔ دور ہو جاؤ بدبختو۔ میری نظروں سے دور ہو جاؤ میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔" اجنبی دھاڑا۔ وہ چاروں بوکھلا کر دروازے کی طرف بڑھے۔ گلوریا کے دل میں نفرت کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

نووارد گلوریا کے قریب آیا اور بڑے نرم لہجے میں بولا۔ "مس گلوریا۔ مجھے دلی افسوس ہے کہ آپ کو پریشانی اٹھانی پڑی۔ میں اپنے دوستوں کی اس ذلالت کے لئے آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ میں جانتا ہوں ان کا یہ اقدام ناقابل معافی ہے لیکن میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ انہیں معاف کر دیجئے۔ یقین کیجئے یہ سب کچھ میری لاعلمی میں ہوا۔"

"تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟" گلوریا نے خوف اور حیرت کے ملے جلے تاثرات سے کہا۔

"یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ مجھے آپ کے محترم والد اور آپ کی آمد کی

اطلاع مل گئی تھی۔ آپ جیسی حسین خاتون کے نام سے بھلا کون واقف نہ ہو گا۔" وہ احتراماً جھکا۔ "میرا نام گاریز ہے۔ براؤن گاریز۔"

"خوب۔ تو یہ وہی گاریز ہے جس کا تذکرہ کرتے ہوئے ماریا کی آنکھوں میں تابناک سی چمک آ جاتی ہے۔" گلوریا نے سوچا۔

"مسٹر گاریز۔ کیا تم مجھے میرے گھر پہنچا سکتے ہو؟" گلوریا نے کہا۔

گاریز نے عیاری سے کہا۔ "میرا خیال ہے آپ نے اب تک مجھے معاف نہیں کیا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ براہ کرم مجھے میرے گھر پہنچا دو یا پھر مجھے خود ہی پیدل جانا ہو گا۔" گلوریا نے کہا۔

"کیا میں اپنی ذاتی معصومیت کا کسی صورت آپ کو یقین نہیں دلا سکتا۔" گاریز نے دھیمے لہجے میں کہا۔

بظاہر گاریز کے لہجے سے خلوص اور معصومیت ٹپک رہی تھی اور وہ خود کو مہذب اور شائستہ ظاہر کرنے پر مصر تھا لیکن خدا معلوم کیوں گلوریا کے دل میں اس کی ہر بات پھانس کی طرح اترتی چلی جا رہی تھی۔ خوف، وہم، شک اور وحشت کے جذبات نے اس کے سوچنے کی تمام تر قوتیں سلب کر لی تھیں۔ وہ بولی۔ "میرا خیال ہے مجھے پیدل ہی جانا پڑے گا۔"

گاریز نے جھک کر کہا۔ "میری بگھی آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہے۔ بدقسمتی سے میں اس وقت آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ لیکن میں اپنے ایک نوجوان کو ہدایات دے کر۔۔۔"

"جی نہیں شکریہ۔ اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔" گلوریا نے بدمزگی سے کہا۔ "میں پیدل چلنے کو ترجیح دوں گی۔" گلوریا تیزی سے دروازے کی طرف مڑی تاکہ باہر جا سکے۔

گاریز اس کے شانہ بشانہ چلتا ہوا صدر دروازے تک آیا اور اسے رات کے اس پرہول سناٹے میں تنہا باہر جانے سے منع کرنے لگا۔ لیکن گلوریا نے سختی سے اس کی ہر پیشکش اور درخواست رد کر دی اور باہر نکل آئی۔ "میں کل صبح سب

سے پہلے اس بھیانک واقعے کی اطلاع پولیس کو دوں گی۔"

"خدا کے لئے مس۔ ایسا نہ کیجئے گا میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔" گاریز نے کہا۔ "آپ نہیں جانتیں اس گاؤں میں میری اچھی ساکھ داغدار ہو جائے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی قسم کا کوئی سکینڈل میری ذات سے منسوب کیا جائے۔"

"اور تمہارا اپنے "نفیس" اور "تہذیب یافتہ" مہمانوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟" گلوریا نے طنزاً کہا۔

"آپ ان کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ میں انہیں ایسی عبرتناک سزا دوں گا کہ وہ پھر کبھی ایسی حرکت نہیں کریں گے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انہیں ان کے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

گلوریا نے گاریز کی بات مان لی اور گاریز گلوریا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا۔

"میں آپ سے صرف اتنی سی التجا کروں گا کہ آپ ٹین کی کانوں کی طرف مت جائیے گا۔ وہ جگہ بے حد مخدوش ہے اور کسی وقت بھی وہاں کی زمین دھنس سکتی ہے۔"

گلوریا نے بے چینی سے اپنے ہونٹ کاٹے اور چاند کی روشنی میں باہر سڑک پر نکل آئی۔ چاروں طرف اسی روح فرسا سناٹے نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ ہر طرف ایک بھیانک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ذرا سی آہٹ پر بھی گلوریا کا دل بری طرح لرزنے لگتا۔ اس کا جسم سوکھے پتے کی مانند کانپنے لگتا۔ خوف اور وسوسوں نے اسے تیز چلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ دور چاندنی میں اس نے دیکھا کہ ٹوٹے پھوٹے مکانات کا ایک چھوٹا سا سلسلہ ایک بھیانک منظر پیش کر رہا تھا۔ پرانی سی پن چکی ذرا سی دیر کو چلی اور پھر رک گئی۔ اس کی چرچراہٹ سن کر گلوریا کا دل ایک بار پھر خوف سے کانپ اٹھا۔ وہ سمجھی کہ یہ شاید اس کی نظر کا فریب ہے۔ لیکن اس نے پھر غور سے دیکھا تو چکی کے پنکھے چل رہے تھے۔ براؤن گاریز کی وارننگ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے دل میں تجسس اور ماریا کو تلاش کرنے کی لگن نے پھر سر ابھارا۔ وہ آہستہ آہستہ ٹین کی بوسیدہ کانوں کی طرف چل پڑی۔

عمارت کی حالت بے حد مخدوش اور خطرناک تھی۔ ہر طرف موت کا سناٹا طاری تھا۔ گلوریا اندر جانے سے پہلے ذرا جھجکی۔ پھر آہستہ سے ایک بڑے سے پتھر کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔ کچھ فاصلے پر اسے دو سائے حرکت کرتے نظر آئے۔ اس نے بے یقینی کے عالم میں آنکھیں مل کر دیکھا۔ چاندنی کی زرد روشنی ذرا دیر کو مدھم ہو گئی۔ چاند ایک بادل کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ پھر جب چاند نے بادل سے جھانکا تو اس کی روشنی میں گلوریا نے ایک دلدوز منظر دیکھا۔

اس کی ہڈیوں میں یخ بستہ لہر دوڑ گئی اور رگوں میں خون جمنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی ہو۔ وہ تیزی سے پلٹی اور واپس سڑک کی طرف دوڑی۔ اس نے سنا جیسے فضا میں کسی کی سسکی کی آواز گونجی ہو۔ وہ پھر مڑی۔ پن چکی کے پر ساکت تھے۔ دونوں سائے اب واضح ہوتے جا رہے تھے۔ گلوریا کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

دونوں مردے کفن پہنے ہوئے تھے۔ ہوا کے جھونکوں سے ان کے خشک اور سوکھے ہوئے بال لہرا رہے تھے۔ ان کی آنکھیں بے نور اور ساکت تھیں۔ جیسے وہ دور کہیں خلاؤں میں گھور رہے ہوں۔ کسی سلیٹی کپڑے کی طرح ان کے چہروں کا رنگ سرمئی سا تھا۔ ایک مردے نے اپنے ہاتھوں پر ایک عورت کی لاش اٹھا رکھی تھی۔ چاند کی صاف روشنی میں گلوریا نے غور سے دیکھا۔ یہ لاش اس کی عزیز سہیلی ماریا والٹ کی تھی۔ جو خون میں نہائی ہوئی تھی۔

کفن پوش مردہ اپنے ہاتھوں پر ماریا کی لاش اٹھائے ہوئے آہستہ سے آگے بڑھا۔ گلوریا نے ایک دلدوز چیخ ماری اور پیچھے ہٹی۔ اس بھیانک عفریت نے اپنا منہ کھولا۔ گلوریا کو یوں لگا جیسے وہ ہنس رہا ہو۔

"ماریا۔" گلوریا بے اختیار زور سے چیخی اور اپنے تمامتر خوف کے باوجود غیرارادی طور پر مردے کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ یکایک مردے نے ماریا کی لاش زمین پر پھینک دی اور تیزی سے بھاگ کھڑا ہوا۔ گلوریا دو زانو ہو کر ماریا کی لاش کے قریب بیٹھ گئی۔

"ماریا۔ ماریا۔" گلوریا بری طرح رونے لگی۔ اس نے ماریا کا بے جان چہرہ

اپنی طرف گھمایا لیکن ماریا اس سے بہت دور جا چکی تھی اور گلوریا کے تمام کپڑے ماریا کے خون سے تربتر ہو گئے تھے۔

☆○☆

والٹ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر آیا۔ اس نے چرچ یارڈ میں اپنے بوٹوں پر جمی ہوئی مٹی جھاڑی۔ اندر کاؤنٹ کارلائل اس کے منتظر تھے۔ ان کا چہرہ کشیدہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے دن بھر کی تھکن اور پریشانی نے انہیں نڈھال کر دیا ہو۔ کاؤنٹ کارلائل اپنی جگہ سے اٹھے اور اسے یہ بھیانک خبر سنائی کہ ماریا اپنے کمرے میں موجود نہیں ہے۔ والٹ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"میں کہتا ہوں ماریا اپنے کمرے میں موجود نہیں ہے۔" کاؤنٹ کارلائل پھر چیخے۔ یکایک ان کے چہرے سے تاسف اور درد جھلکنے لگا۔ "وہ باہر کہیں دور جھاڑیوں میں موجود ہے۔ لیکن اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔" ان کی آواز رندھنے لگی۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں پر قابو رکھے ہوئے تھے۔

"نہیں نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔" والٹ ہذیانی انداز میں چیخا۔ "ماریا مجھے یوں تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔"

کاؤنٹ کارلائل نے بڑے یقین سے کہا۔ "گلوریا کو اس کی لاش مل گئی ہے۔"

"نہیں نہیں نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔" والٹ خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ وہ پاگل سا ہو کر چیخ رہا تھا۔ کاؤنٹ کارلائل نے سائیڈ بورڈ سے وہسکی نکالی اور ایک جام بنا کر والٹ کو دیا۔ والٹ بری طرح ہچکیاں لے کر رو رہا تھا۔ اس کی دردناک سسکیوں کی آواز سن کر یوں احساس ہوتا تھا جیسے اس پر ہسٹیریا کے دورے پڑ رہے ہوں۔ شراب کی تلخی نے اس کے حلق میں آگ سی لگا دی۔ آنسو اب بھی اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ لیکن اب وہ خاموش ہو چکا تھا۔ والٹ کو شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ سب کچھ اس کی اپنی غفلت کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس نے ماریا کی بیماری کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ دوسرے مریضوں میں گھرے رہنے کی وجہ سے وہ اپنی شریک حیات کی طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ اب یہ سب کچھ اس کے لئے

ایک بھیانک خواب بن کر رہ گیا تھا۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ اس نے ماریا کی کس قدر حق تلفی کی ہے۔ وہ بے اختیار چیخا۔

"میں نے اسے مار ڈالا۔ میں اس کا قاتل ہوں۔"

کاؤنٹ کارلائل نے اس کے شانے تھپتھپائے اور تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "صبر کرو۔ والٹ۔ گزری ہوئی باتوں کو دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ خود کو سنبھالو۔ زندگی بہت طویل اور صبر آزما مراحل کا دوسرا نام ہے۔"

والٹ نے کئی بار یہی الفاظ مرنے والوں کے لواحقین سے کہے تھے اور آج وہ خود ان الفاظ کے کرب اور اذیت سے دوچار ہو رہا تھا۔ درد سے اس کا دل پھٹا جا رہا تھا۔

"یہ سب کچھ محض میری وجہ سے ہوا۔ یہ سب میری غلطیوں اور کوتاہیوں کا نتیجہ ہے۔ اب میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ کچھ بھی تو نہیں۔" اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا اور بلک بلک کر رونے لگا۔

"کیا تم مجھے لاش کے پوسٹ مارٹم کی اجازت دو گے؟" کاؤنٹ کارلائل نے کہا۔ ان کی آواز جیسے کہیں دور سے آ رہی تھی۔

"ماریا کی لاش کا پوسٹ مارٹم۔" والٹ کو جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ چونک پڑا۔ "نہیں نہیں۔ میں تمہیں اس کے دلکش بدن کو چیر پھاڑ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔" اس نے صاف انکار کر دیا لیکن کاؤنٹ کارلائل کے سمجھانے بجھانے اور اصرار کرنے پر آخرکار وہ رضامند ہو گیا۔ اسے مختلف خدشوں اور اندیشوں نے نیم جان کر رکھا تھا۔ وہ بڑبڑایا۔

"ماریا کہاں ہے؟"

کاؤنٹ کارلائل بولے۔ "میں تمہیں بتاتا ہوں۔"

اسی اثنا میں گلوریا کمرے میں آ گئی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا اور وہ بے حد کمزور نظر آ رہی تھی۔ کاؤنٹ کارلائل نے اسے آرام کرنے کی تاکید کی۔

"نہیں۔ میں ہرگز آرام نہیں کر سکتی۔ ہم میں سے کوئی بھی آرام نہیں کر

سکتا تاوقتیکہ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ سب کیا معاملہ ہے؟"

وہ بڑی ہمدردی سے اور ترس کھانے والے انداز میں ڈاکٹر والٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گوشے نم تھے۔ ڈاکٹر والٹ نے محسوس کیا کہ گلوریا بڑی مشکل سے آنسو روکے ہوئے تھی۔

☆○☆

سارجنٹ اور اس کا کانسٹیبل ابھی ابھی بڑبڑاتے ہوئے اپنے بستروں میں لیٹے تھے۔ تھکن سے ان کی پنڈلیاں درد کر رہی تھیں۔ لیکن ان کی بڑبڑاہٹ چڑچڑے پن میں تبدیل ہو گئی' جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ گلوریا نے کیا دیکھا تھا۔

والٹ کو ان تمام واقعات کا علم اس وقت ہوا جب وہ جھاڑیوں کی طرف جا رہے تھے۔ یہ سب کچھ ناقابل یقین معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھیانک عفریت ماریا کو اپنے ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پورا گاؤں بدروحوں' چڑیلوں اور بھوتوں کا مسکن بن کر رہ گیا ہو۔

لالٹین کی مدھم روشنی زمین پر پڑ رہی تھی۔ گلوریا ان لوگوں کو راستہ بتا رہی تھی۔ یکایک کانسٹیبل نے خوفزدہ ہو کر سارجنٹ کی آستین پکڑ لی۔ "سر۔ وہ دیکھیے۔ وہ کیا ہے؟"

سب کی نگاہیں جوتوں کے ایک جوڑے پر پڑیں۔ گھاس پر اوندھے منہ مارٹی شراب کے نشے میں دھت پڑا ہوا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ماریا کی لاش جھاڑیوں میں پڑی ہوئی تھی۔ لاش بری طرح مسخ ہو چکی تھی۔ اس کے کپڑوں پر جگہ جگہ خون کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور سارا جسم خون میں لت پت تھا۔ یہ ایک بھیانک منظر تھا جسے دیکھ کر سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

مارٹی نیند میں غرایا لیکن سارجنٹ نے خوف اور غصے کے ملے جلے جذبات لئے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ "حرامزادے۔ چلو اٹھو یہاں سے۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

پھر اس نے مارٹی کو اپنے بوٹ سے ٹھوکر لگائی۔ مارٹی بیزاری سے کروٹ لے کر اٹھ بیٹھا۔ پھر وہ تیزی سے اندھا دھند دوڑا اور ماریا کی لاش سے ٹکرا کر

اوندھے منہ زمین پر جا گرا۔ اس بار سارجنٹ نے اسے سختی سے دبوچ لیا اور اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔

صبح کاذب کے آثار نمودار ہوا چاہتے تھے۔ شرابی مارٹی کو بمشکل تمام گھسیٹ کر پولیس سٹیشن لایا گیا اور ماریا کی لاش کو ڈاکٹر کے گھر پہنچا دیا گیا۔ گاؤں میں کسی کو کانوں کان اس المیے کی خبر نہیں ہوئی اور ماریا کی لاش بڑی خاموشی سے چپ چاپ والٹ کے گھر بھجوا دی گئی۔

ڈاکٹر والٹ احساس سے عاری چہرہ لئے ماریا کے بے جان جسم کو گھور رہا تھا۔ کاؤچ پر ماریا برہنہ پڑی ہوئی تھی۔ اس کا جسم اذیت اور کرب سے اینٹھ گیا تھا اور صورت مسخ ہو چکی تھی۔ والٹ باوجود کوشش کے ماریا کے چہرے کی طرف نہیں دیکھ پا رہا تھا۔

کاؤنٹ کارلائل خاصے مطمئن نظر آ رہے تھے۔ غالباً" اب وہ اپنے پروفیشن کے اس مرحلے میں پہنچ چکے تھے جہاں جذبات اور رشتوں کی اہمیت ثانوی ہو جاتی ہے اور اسی لئے وہ بڑے پرسکون انداز میں لاش کا معائنہ کر رہے تھے۔ پھر کاؤنٹ کارلائل نے سوئی اٹھائی اور ماریا کی لاش کے کولہے پر چبھوتے ہوئے کہا۔

"والٹ۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو۔ یہ بڑا غیر معمولی سا واقعہ ہے۔"

والٹ کے چہرے پر خوف اور تردد کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ حالانکہ ماریا کے دل کی حرکت بند ہو چکی تھی لیکن اس کے جسم کا گوشت سرد یا مردہ نہیں تھا۔ کاؤنٹ کارلائل نے تیزی سے ماریا کے بازو پر بندھی ہوئی پٹی کھولی۔ خون کے بلبلے ابل ابل کر فرش پر گرنے لگے --- تازہ سرخ خون --- کاؤنٹ کارلائل کے دونوں ہاتھ خون میں لتھڑ گئے۔

یکایک انہوں نے دونوں ہاتھوں میں خون کو ملا اور پھر کونے میں رکھی ہوئی خوردبین کی طرف بڑھے۔ انہوں نے بجلی کی سی تیزی سے ایک شیشے کی سلائیڈ پر خون ملا اور خوردبین کے نیچے رکھ کر اس کا مشاہدہ کرنے لگے۔ پھر وہ گھبرا کر پیچھے ہٹے اور چیخے۔

"والٹ یہاں آؤ۔ غالباً" تم نے اب تک ایسی ناقابل یقین چیز کبھی نہیں دیکھی

ہو گی۔"

والٹ نے فوراً آکر خوردبین سنبھالی اور وہ بھی تیورا کر پیچھے ہٹا۔ یہ کسی درندے کا خون تھا۔

"یہ خون ہرگز ماریا کا نہیں ہو سکتا۔" والٹ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور کرسی پر گر پڑا۔

کاؤنٹ کارلائل نے اسے بازو سے تھام کر اٹھایا اور میز کے قریب رکھے ہوئے چمکدار جراحی کے آلات کی طرف لے جاتے ہوئے بولے۔ "میرا خیال ہے اب ہمیں اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔"

والٹ کے حلق میں آواز پھنس گئی اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کاؤنٹ کارلائل نے بڑی نرمی سے نشتر اٹھایا اور ماریا کے پیٹ پر ایک گہرا شگاف لگایا۔ خون پھر ابل ابل کر باہر گرنے لگا۔ وہ یکے بعد دیگرے مختلف جگہوں پر نشتر زنی کرتے رہے۔ وہ اپنی پوری کوشش کر رہے تھے کہ ماریا کی لاش کو کم سے کم تکلیف ہو۔ ایک گھنٹے کی مسلسل محنت اور عرق ریزی بھی لاحاصل رہی۔ جگہ جگہ جسم پر شگاف ڈالنے کے باوجود ان کو ماریا کے جسم سے کوئی ایسی چیز دستیاب نہیں ہو سکی جو اس کی پراسرار ہلاکت یا اس بیماری پر کوئی روشنی ڈال سکتی۔ آخر کاؤنٹ کارلائل نے ایک بڑی سی سفید چادر اٹھائی اور لاش پر ڈال دی۔

والٹ کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے ماریا ابھی ابھی اٹھ بیٹھے گی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر لپٹ جائے گی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ "کاش میں نے اپنی بیوی کو اس المناک موت سے ہمکنار ہونے سے پہلے ہی بچا لیا ہوتا۔" اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ایک معمولی سا زخم جو ماریا کے بازو میں شیشہ لگ جانے کی وجہ سے آیا تھا اس کی موت کا باعث بن جائے گا۔ اب وہ رہ رہ کر خود کو کوس رہا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ اب بے معنی اور لاحاصل تھا۔

والٹ کو خیال آیا کہ اگر اس نے اور لاشوں کا پوسٹ مارٹم بھی کیا ہوتا تو بھی نتیجہ صفر ہی رہتا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اسے شدید چکر آ رہے تھے اور وہ گرنے کے قریب تھا کہ کاؤنٹ کارلائل نے اسے سنبھال کر آرام

کرسی پر لٹا دیا۔

"میری جان تمہیں بے حد آرام کی ضرورت ہے۔ تم گزشتہ چوبیس گھنٹوں سے ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوئے۔ میرا خیال ہے تم اوپر جا کر آرام کرو۔"

"آرام؟ کیسا آرام؟" والٹ نے چیختے ہوئے کہا۔ "میری ماریا بے آرام ہے اور میں آرام کرتا رہوں۔ کاؤنٹ کارلائل خدا کے لئے میرے زخموں پر نمک پاشی نہ کریں۔ میں بیحد پریشان ہوں۔"

"پریشان تو میں بھی ہوں میرے دوست۔" کاؤنٹ کارلائل نے کہا۔ "اور جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں یہ بیماری کوئی پراسرار قسم کا طاعون ہے جس نے اس گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ خدا ہم سب کی حفاظت کرے۔ میں حیران ہوں کہ آخر اتنی اموات ایک ہی قسم کی علامات سے کیونکر واقع ہو گئیں؟"

اس دوران دروازے پر کسی نے دستک دی۔ کاؤنٹ کارلائل نے دروازہ کھولا۔ باہر سارجنٹ کھڑا تھا۔ اس کی نظریں حیران سی تھیں۔ والٹ نے اسے ایک طرف ہٹایا اور تیزی سے باہر کی طرف چل پڑا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ "میں چاہتا ہوں میری ماریا کی تجہیز و تکفین شاندار طریقے سے ہو۔ بخدا یہ سب کچھ گاؤں والوں کے لئے اس سال کا سب سے بڑا واقعہ ہو گا۔"

والٹ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چرچ کی طرف جا رہا تھا تاکہ جلد از جلد ماریا کی تدفین کے لئے گورکن اور پادری کا انتظام کر سکے۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ گاؤں والوں پر جو یہ بھیانک آفت نازل ہوئی تھی اس کا حل کسی کے پاس نہیں تھا۔ جوں ہی وہ چرچ یارڈ عبور کر کے چرچ کے دروازے پر پہنچا کہ اس کی نگاہوں میں مارٹی کے جوان بھائی کا چہرہ گھوم گیا جسے تدفین کے چند گھنٹوں بعد تابوت سے چرا لیا گیا تھا۔ وہ لمحے بھر کو رکا اور سوچنے لگا۔ "کیا میری محبوبہ' میری دلنواز ماریا کو یہ عفریت چین سے ابدی نیند سونے نہیں دیں گے؟"

☆○☆

سارجنٹ نے والٹ کے ہونق سے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے ذہن میں بہت سے سوال کلبلا رہے تھے۔ لیکن وقت اور مصلحت کے تقاضوں کے پیش نظر اس نے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے بھی والٹ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ سارجنٹ جو ایک عام دیہاتی اور سیدھا سادھا سا پولیس والا تھا کاؤنٹ کارلائل کے پاس گیا اور بولا۔ "سر۔ مجھے مارٹی کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔"

کاؤنٹ کارلائل چونک کر بولے۔ "مارٹی۔ اسے کیا ہوا ہے؟ کیا کوئی خاص بات معلوم ہوئی؟"

"جی ہاں سر۔ وہ بڑی بے سروپا باتیں کر رہا ہے۔ لیکن اس کی باتوں کا خالی تابوت سے یقیناً کوئی تعلق ہے۔ اس کی باتیں بڑی بھیانک ہیں۔" سارجنٹ نے دیدے گھماتے ہوئے کہا۔

کاؤنٹ کارلائل نے سارجنٹ کے پریشان چہرے پر ایک نظر ڈالی اور بولے۔ "ٹھیک ہے تم ذرا ایک منٹ ٹھہرو میں تمہارے ساتھ پولیس سٹیشن چلتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ ڈاکٹر والٹ کی لیبارٹری میں گئے جہاں ماریا کی پوسٹ مارٹم کی ہوئی لاش پڑی تھی۔ انہوں نے ڈاکٹر کا کمرہ لاک کر دیا تاکہ اگر تھکن اور پریشانی کے ہاتھوں ستائی ہوئی گلوریا غلطی سے اس کمرے میں چلی جائے تو وہاں کے دہشتناک منظر کو دیکھ کر ہوش نہ کھو بیٹھے۔ پھر وہ سارجنٹ کے ہمراہ پولیس سٹیشن چلے آئے۔ یہاں کانسٹیبل بدستور مارٹی پر تشدد کرنے پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ مارٹی سر کارلائل کو دیکھتے ہی گڑگڑانے لگا۔

"جناب۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ بخدا آپ میری بات پر یقین کیجئے۔ میں جو کچھ بتا چکا ہوں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا اور آپ کو میری بات ماننا ہوگی۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

سارجنٹ نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "تم اس وقت وہاں لاش کے قریب موجود تھے۔ میں تو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا۔ تمام گواہیاں تمہارے خلاف ہیں۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ میں اس لاش کے قریب ہی پڑا ہوا تھا لیکن بخدا میں نے

اسے ہرگز ہرگز قتل نہیں کیا۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں' میں نے اسے نہیں مارا۔ لیکن میں نے جو کچھ دیکھا۔ اف میرے خدا۔ (اس کا جسم ایک بار پھر خوف سے تھر تھر کانپنے لگا) میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ میں نے کیا دیکھا؟"

سارجنٹ نے کہا۔ "سب لوگ اس واقعے کے عینی شاہد ہیں کہ بار میں ڈاکٹر والٹ سے تمہارا جھگڑا ہوا تھا۔ کل رات تم ویسے بھی اس قدر شراب پی چکے تھے کہ تمہیں اپنا ہوش بھی نہیں تھا۔ تم بھلا کیا کہہ سکتے ہو کہ تم نے کچھ دیکھا بھی تھا یا نہیں؟"

اس مرحلے پر کاؤنٹ کارلائل نے مداخلت کی۔ "میں پوچھتا ہوں آخر تم نے کیا دیکھا تھا؟"

مارٹی کاؤنٹ کارلائل کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے وہ اس کے نجات دہندہ ہوں اور بولا۔ "میں نے اپنے بھائی کو دیکھا۔ بخدا وہ وہی تھا۔ وہی جو مرچکا تھا۔ وہی' ہم جسے ہم سب چرچ یارڈ میں دفنا کر آئے تھے۔ میں نے اسے بالکل اسی طرح واضح اور عیاں دیکھا جس طرح اس وقت میں آپ لوگوں کو دیکھ رہا ہوں۔"

"دیکھا آپ نے۔ اس کا دماغ بالکل خراب ہو چکا ہے۔" سارجنٹ نے تاسف سے گردن ہلائی۔ لیکن مارٹی نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں پاگل نہیں ہوں۔ بخدا وہ میرا بھائی ہی تھا۔ سرمئی لباس میں ملبوس۔ اس کے کفن سے تازہ مٹی کی سوندھی سوندھی مہک آ رہی تھی اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ چاہے وہ اس وقت اپنے تابوت میں ہی موجود ہو گا لیکن اس وقت وہ وہاں تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔" مارٹی نس کے لہجے سے ایقان ظاہر تھا۔ اس کی باتیں سن کر کاؤنٹ کارلائل کے دل میں ایک انجانے خوف نے سر اٹھایا۔

وہ سوچنے لگے کہ بدروحوں' بھوتوں' چڑیلوں اور بھیانک عفریتوں نے ہمیشہ ہی پرسکون انسانی زندگی میں تہلکے مچائے ہیں۔ پھر کچھ لمحے بعد وہ بولے۔ "مارٹی۔ تمہارا بھائی مرچکا ہے اور اسے دفن کر دیا گیا ہے۔"

سارجنٹ' مارٹی کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے اسے کسی اور بات کی توقع ہو۔

"مجھے معلوم ہے۔ میں نے اسے خود اپنے ہاتھوں سے دفن کیا تھا۔ لیکن میں حلفیہ کہتا ہوں۔ اس رات وہ میرا بھائی ہی تھا۔ اپنی سرد اور بے نور آنکھوں سے وحشت خیز انداز میں میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کفن میں لپٹا ہوا جیسے وہ ابھی ابھی تابوت سے اٹھ کر چلا آیا ہو۔" مارٹی اپنی بات پر اڑا رہا۔

"سر۔ اب آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟" سارجنٹ نے امید بھری نظروں سے کاؤنٹ کارلائل کی طرف دیکھا۔

کاؤنٹ کارلائل کے دل و دماغ میں سرد جنگ جاری تھی۔ وہ اپنے شاگرد کی بیوی کے قاتل کو منظرعام پر لانے کے شدید خواہشمند تھے۔ مارٹی نے کندھے اچکائے اور مایوسی سے بولا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ کو میری بات کا یقین نہیں آیا؟"

کاؤنٹ کارلائل بولے۔ "اس کے برعکس مجھے تمہارے ایک ایک لفظ کا یقین ہے۔"

کاؤنٹ کارلائل کی بات سن کر باقی تینوں آدمی حیرت زدہ انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگے۔ جیسے انہوں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔ سارجنٹ ان کے ساتھ ساتھ دروازے تک آیا اور کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ انہوں نے اسے تسلی دی کہ وہ اسے بہت جلد نتائج سے آگاہ کر دیں گے۔ وہ بار بار یہی سوچ رہے تھے کہ مارٹی نے واقعی سچ کہا تھا۔

کاؤنٹ کارلائل ٹہلتے ہوئے ڈاکٹر والٹ کے گھر پہنچے۔ گلوریا ابھی تک سو رہی تھی۔ کاؤنٹ کارلائل کے دل میں مختلف اندیشے اور وسوسے جنم لے رہے تھے۔ مارٹی کی باتیں سن کر انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کی نظروں کے آگے ایک بھیانک فلم چل رہی ہو جس میں ہر طرف مردے اور لاشیں گھوم رہی ہوں۔

انہوں نے گلوریا کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ ایک ہلکی سی چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈ رہی تھی۔ پھر یکایک ماریا کا خیال آتے ہی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ کاؤنٹ کارلائل اس کے سرہانے بیٹھ گئے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ "میری بچی۔ کیا تم اس بارے میں کچھ بتانا پسند کرو گی؟"

گلوریا نے بے دلی سے سر ہلا دیا۔ سر کارلائل بولے۔ "تم جب ماریا کے بارے میں مجھے بتا رہی تھیں تو تم نے کہا تھا کہ ماریا کو کسی مردے نے اپنے ہاتھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ کیا تم نے اسے پہچان لیا تھا کہ وہ کون تھا؟"

گلوریا نے دکھ اور کرب سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور زور زور سے کاؤنٹ ہلا کر بولی۔ "نہیں نہیں۔"

کاؤنٹ کارلائل نے بڑے محتاط انداز میں کہا۔ "کیا تم اس آدمی کی صورت بھی بھول گئی ہو جسے تم نے جنازے کے ہمراہ دیکھا تھا؟" ان کا اشارہ واضح طور پر مارٹی کی طرف تھا۔ "پولیس اسے گرفتار کر چکی ہے اور تمہاری ذرا سی غفلت سے ایک بے گناہ کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا جائے گا۔ کیا وہ مارٹی تھا؟"

"میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ مارٹی ہو ہی نہیں سکتا۔" گلوریا نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"لیکن تم تو کہتی ہو کہ تم اس رات والے آدمی کو نہیں پہچان سکی تھیں۔" کاؤنٹ کارلائل نے جرح کی۔

"نہیں۔ لیکن وہ بھلا۔۔۔" گلوریا نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ کچھ کہتے ہوئے خوف زدہ تھی۔ کاؤنٹ کارلائل اس کی بات کی تہہ کو پہنچ گئے تھے۔ گلوریا کی آنکھوں میں دہشت اور خوف کے سائے لہرا رہے تھے۔

کاؤنٹ کارلائل نے پھر کہا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ اس رات تم نے جس مردے کو دیکھا وہ اسی شخص کی لاش تھی جو سڑک کے کنارے گرے ہوئے تابوت سے باہر جا گری تھی۔ کیا یہ وہی تھا؟" کاؤنٹ کارلائل نے بار بار کہا۔

تب گلوریا نے کہا۔ "ہاں یہ وہی تھا۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟"

"تمہیں اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس صدمے نے تمہارے دماغ کو متاثر نہیں کیا۔" کاؤنٹ کارلائل نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر انہوں نے گلوریا کا کندھا تھپتھپایا اور اسے آرام سے بستر پر لٹا دیا۔ "اب تم سو جاؤ۔ لیکن صرف ایک بات کا جواب اور دو۔ وہ یہ کہ کیا ماریا واقعی اسی جگہ تھی جہاں تم نے اسے اس لاش کے ہاتھوں میں دیکھا تھا؟"

گلوریا بولی۔ "جی نہیں۔ میں نے اسے پرانی کانوں کے نزدیک دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اب بھی میں اس جگہ کی نشاندہی کر سکتی ہوں۔" وہ بڑے یقین سے بستر سے اٹھنے لگی۔

کاؤنٹ کارلائل نے سختی سے کہا۔ "لیکن میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ تم یہاں گھر پر ہی رہو گی۔"

وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آئے۔ یہاں والٹ اپنا زرد چہرہ لئے ان کا منتظر تھا۔ "سب انتظامات مکمل ہو گئے ہیں۔" وہ سرد مہری سے بولا۔

"والٹ۔ آؤ کچھ دیر کے لئے باہر چلیں۔ ہم راستے میں سے سارجنٹ کو اپنے ہمراہ لے چلیں گے۔" کاؤنٹ کارلائل نے اس کی توجہ ہٹاتے ہوئے کہا۔

انہیں ٹین کی کان تلاش کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ وہ کچھ دیر بعد ایک ویران اور شکستہ عمارت کے دروازے پر کھڑے تھے۔ اس جگہ کی وحشت اور ویرانی دیدنی تھی۔ ہر طرف ایک روح فرسا خاموشی طاری تھی۔ سارجنٹ نے زمین پر بوٹ سے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ "سنا گیا ہے یہاں ٹین کے ذخائر موجود ہیں۔"

"بات یہ ہے جناب کہ یہاں کئی کان کن مارے گئے۔ بہت سے ایسے عجیب واقعات ہوئے ہیں کہ لوگ اس کان کے بارے میں مشکوک ہو گئے ہیں۔ یہ کان بھی آسیب زدہ مشہور ہو گئی اور لوگ دن میں بھی اس کے قریب آنے سے گریز کرنے لگے۔ یہ کان گاریز کی ملکیت ہے۔ ظاہر ہے اسے سب سے زیادہ نقصان پہنچا ہو گا؟"

کاؤنٹ کارلائل نے پوچھا۔ "اور پھر اس کان کو دوبارہ شروع نہیں کیا گیا؟"

سارجنٹ نے شانے اچکائے۔ "دراصل گاریز کو اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس کے پاس بہت مال ہے جناب۔"

کاؤنٹ کارلائل کان کے اسٹیئرنگ وہیل کے قریب گئے اس پر تیل لگا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے اگر برسوں سے اس کان کو استعمال ہی نہیں کیا گیا تو پھر وہیل پر یہ تیل کہاں سے آ گیا۔

"اور یہ سب روپیہ ہملٹن کے پاس کہاں سے آتا ہے؟" انہوں نے سارجنٹ سے پوچھا۔

"جناب۔ سنا ہے کہ جب گاریز کا باپ مرا تھا تو ہزاروں کا مقروض تھا۔ گاریز گاؤں کے نزدیک ہی اپنے مکان میں تالا لگا کر بیٹھ جاتا تھا اور کئی کئی دن باہر نہیں آتا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اب اس کے مکان میں اس کے دوستوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے اور ہر وقت محفل ناؤ نوش گرم رہتی ہے۔ سنا ہے کہ یہ لوگ روپیہ پانی کی طرح بہاتے ہیں اور دل کھول کر عیش و عشرت میں ڈوبے رہتے ہیں۔" سارجنٹ نے احمقانہ انداز میں کہا۔

کاؤنٹ کارلائل نے طنز کیا۔ "اور ان لوگوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ کان آسیب زدہ ہے۔ یہاں بھوت رہتے ہیں۔"

سارجنٹ نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور بولا۔ "جی ہاں بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔"

پھر کاؤنٹ کارلائل بولے۔ "اس وہیل پر لگے ہوئے تازہ تیل کو دیکھنے کے بعد یہ بات بعید از قیاس ہے کہ عرصہ دراز سے کسی نے اس کان میں قدم ہی نہیں رکھا۔"

والٹ نے اس گفتگو میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ اپنی بیوی ماریا کی موت کے صدمے نے اسے نڈھال اور نیم جان کر دیا تھا۔ کاؤنٹ کارلائل سوچ رہے تھے، کیا یہ ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک ایسی کان میں جس میں ٹین کے ذخائر موجود ہوں اور جہاں لوگ دن میں آتے وقت خوفزدہ ہو جاتے ہوں، وہاں رات کی تاریکی میں مردوں اور لاشوں سے کام لیا جاتا ہو۔

☆○☆

گلوریا صبح سے گھر کی صفائی میں لگی تھی۔ اس نے ایک ایک کونا کھدرا صاف کر دیا تھا۔ ابھی وہ ان سب کاموں سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ گلوریا نے تیزی سے دروازہ کھول دیا۔ لیکن بعد میں اسے خیال آیا کہ اسے دروازہ نہیں کھولنا چاہیے تھا۔ بہرحال اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ گاریز دروازے پر کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک کوند رہی تھی۔

"کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟" اس نے بڑے مہذب لہجے میں اندر آنے کی

اجازت چاہی۔ وہ کچھ تھکا ہوا اور پریشان سا دکھائی دے رہا تھا۔ گلوریا انکار نہ کر سکی۔ وہ ایک طرف ہٹی اور اسے اندر آنے کے لئے راستہ دے دیا۔

"مس۔ ہماری گذشتہ ملاقات کچھ اچھے ماحول میں نہیں ہوئی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اب آپ مجھ سے کبھی نہیں ملیں گی۔ لیکن میں یہاں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ میں آپ کی سہیلی مسز ماریا والٹ کی موت کی خبر سن کر تعزیت کے لئے حاضر ہوا تھا۔" اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "میں انہیں اچھی طرح سے تو نہیں جانتا تھا لیکن بہرحال میری طرف سے دلی تعزیت قبول کیجئے۔"

گلوریا کو یہ سب کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ اس نے بیزاری سے کہا۔

"شکریہ۔ لیکن میرا خیال ہے آپ کو تعزیت کے لئے ماریا کے شوہر کے پاس جانا چاہیے تھا۔"

کاریز عیاری سے مسکرایا۔ "مس گلوریا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ میری تعزیت قبول نہیں کریں گے کیونکہ میرے بارے میں ان کی رائے کچھ اچھی نہیں۔ ویسے بھی وہ مجھے پسند نہیں کرتے۔"

"لیکن میرا خیال ہے کہ دوسروں کی رائے سے تمہاری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا مسٹر کاریز۔" گلوریا نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

گلوریا نے محسوس کیا کہ کاریز کے چہرے پر ہوس اور شہوت کے سائے گہرے ہو چلے ہیں۔ وہ تذبذب کے انداز میں اپنی انگلیاں چٹخا رہا تھا۔ وہ بولا۔ "مس گلوریا' میں نے ہمیشہ لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ لوگ میری شان و شوکت سے جلتے ہیں۔ شاید میں لوگوں کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔۔۔۔ یا پھر وہ لوگ میرے معیار کو سمجھنے سے قاصر رہے ہوں گے۔" وہ پھر مسکرایا۔ "بہرحال میں نے آپ کا خاصا وقت ضائع کیا۔ میں کچھ تھک گیا ہوں۔ کیا آپ مجھے ایک گلاس پانی پلانا پسند کریں گی۔ ماریا کی موت کی خبر سن کر میں سیدھا آپ کی طرف ہی چلا آیا تھا۔" اس کے لہجے سے تھکن ظاہر تھی۔

"یقیناً۔" گلوریا نے فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔ پھر وہ کچن کی طرف جانے کے لئے مڑی۔ لیکن بڑی شائستگی سے اس نے رک کر پوچھا۔ "میرا خیال ہے

تم ایک گلاس شیری پینا پسند کرو گے؟"

کاریز احتراماً" جھکا اور گلوریا نے سائیڈ بورڈ سے شیری کی بوتل نکالی۔ غیر متوقع طور پر کاریز نے اس سے پوچھا۔ "مس گلوریا۔ کیا آپ موت کے بعد کی زندگی میں یقین رکھتی ہیں؟"

"یہ ایک مہمل سا سوال ہے۔ تمہیں اجنبیوں سے ایسے سوال نہیں کرنا چاہئیں۔" گلوریا نے ناگواری سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اب آپ مجھے اجنبی نہیں سمجھ رہیں۔" کاریز نے بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔ لیکن گلوریا اسے ایسا کوئی موقعہ نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ تیزی سے بولی۔

"ہاں مجھے موت کے بعد کی زندگی پر یقین ہے۔ کیا تم بھی ---"

"ہاں میں بھی اس بات پر یقین رکھتا ہوں۔" کاریز نے اس کی بات کاٹی۔

یکایک کاریز کے ہاتھ میں تھامے ہوئے شیری کے گلاس کا پیندا چٹخا اور گلاس ٹوٹ کر فرش پر جا گرا۔ وہ دونوں بیک وقت شیشے کی کرچیاں اٹھانے کے لئے جھکے۔ لمحہ بھر کے لئے ان کے ہاتھ آپس میں ٹکرائے اور گلوریا کی چھوٹی انگلی میں جیسے کسی نے زہر بھرا نشتر چبھو دیا۔ وہ درد سے بے چین ہو گئی۔ جونہی وہ سیدھی کھڑی ہوئی' اس کی انگلی کے زخم سے خون بہنے لگا۔ حالانکہ اسے یقین تھا کہ اس نے ابھی شیشے کی کرچی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔

"میں کس قدر لاپروا انسان ہوں۔" کاریز نے تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ یہ کہتے ہوئے کاریز نے اپنا بازو آگے کر دیا اور گلوریا نے دیکھا کہ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک مڑی ہوئی انگوٹھی پہن رکھی تھی جس کی تیز نوکیلی دھار سے گلوریا کا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا۔ اس نے گلوریا کا بازو تھاما اور اسے سائیڈ بورڈ کے قریب لے گیا۔ اس نے گلوریا کا ہاتھ ایک چھوٹے سے شیشے کے گلاس پر رکھ دیا۔ خون کی بوندیں تیزی سے ٹپک ٹپک کر گلاس میں جمع ہونے لگی۔ پھر کاریز نے اپنی جیب سے ایک سفید رومال نکال کر اسے گلوریا کی انگلی کے گرد لپیٹ دیا۔

گلوریا اسے ایسا کرنے سے روکنا چاہتی تھی لیکن درد کی ٹیسیں اسے بے چین

کئے دے رہی تھیں۔ وہ بولی۔ "کوئی بات نہیں۔ یہ ایک معمولی سی خراش ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی۔"

لیکن گاریز رومال کس کر اس کی انگلی کے گرد لپیٹ چکا تھا۔ "بس اب ٹھیک ہے۔ اگر کہیں سے ایک پن مل جاتی تو ڈریسنگ مکمل ہو جاتی۔"

گلوریا ایلس کی الماری کے قریب گئی اور اس کے اسٹچنگ بکس میں سے ایک پن نکال لائی۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ سے پن نہیں لگا سکتی تھی۔ یہاں بھی گاریز نے اس کی مدد کی اور پن لگا دی۔ پھر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ گلوریا اسے رسمی طور پر رخصت کرنے کے بعد دل ہی دل میں بے حد مطمئن تھی کہ وہ جلد ہی چلا گیا۔

اس نے فرش پر بکھری ہوئی کرچیاں اٹھائیں اور کارنس پر رکھا ہوا شیشے کا وہ گلاس بھی اٹھا لیا جس میں اس کی انگلی سے خون ٹپک کر جمع ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں ناقابل یقین حیرت اور خوف سے باہر کو ابل پڑیں۔ گلاس بالکل صاف تھا۔ اس میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں تھا۔ جیسے کسی نے اسے دھو کر صاف کر دیا ہو۔ حالانکہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ خون کافی مقدار میں ٹپک کر اس میں جمع ہوا تھا۔ اسے یہ چیز مبالغے کی حد تک جھوٹ معلوم ہونے لگی۔ لیکن یہ سب کچھ ایک بھیانک حقیقت کی طرح اس کے سامنے تھا۔

اس کی انگلی میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ وہ گھر کے کام کاج میں لگ گئی لیکن ہر بار اس کی توجہ رہ رہ کر اپنی انگلی پر لپٹی ہوئی پٹی کی طرف جاتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اردگرد کے ماحول سے نظریں چرا کر ڈاکٹر کی لیبارٹری کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔

کچھ دیر پہلے گاؤں سے دو عورتیں تابوت لے کر آئی تھیں اور انہوں نے کمرہ بند کر کے ماریا کو تابوت میں لٹا دیا تھا۔ والٹ خود وہاں نہیں آیا تھا۔ اپنی بیوی کی آخری رسوم میں وہ شریک ضرور ہونا چاہتا تھا لیکن درد اور غم سے اس کا کلیجہ شق ہوا جاتا تھا۔

گلوریا نے بھی اس رات کے بعد سے اب تک اپنی عزیز سہیلی ماریا کا چہرہ نہیں

دیکھا تھا۔ وہ چہرہ جسے وہ کئی بار اپنے ہاتھوں میں لے کر محبت سے چوم چکی تھی۔ آخر اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ جھاڑن ایک طرف پھینک دیا اور دیوانہ وار لیبارٹری کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ ماریا تابوت میں تھی۔ اس کا چہرہ زرد اور بے جان تھا۔ لیکن گلوریا نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے کے نقوش میں ایک عجیب سی بے کلی اور وحشت انگیز بے چارگی کا عنصر نمایاں ہے جس نے گلوریا کو بے چین کر دیا۔

گلوریا نے بہت سی لاشیں دیکھی تھیں لیکن ماریا کے چہرے سے ہیبت اور مردنی عیاں تھی۔ گلوریا نے ماریا کے بازو کی پٹی ہٹائی۔ تاکہ اس کے زخم کو دیکھ سکے۔ اسی لمحے خود اس کی اپنی انگلی میں درد کی ایک ٹیس اٹھی اور وہ تڑپ کر رہ گئی۔ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ اسے یوں لگا جیسے ماریا کے ہونٹ ہلے ہوں اور وہ ایک چیخ مار کر کانپتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے کانوں میں گاریز کے ہنسنے کی آواز آ رہی ہو۔ اس میں تمسخر نمایاں تھا۔ گلوریا نے کبھی گاریز کی ہنسی کی آواز پہلے نہیں سنی تھی۔ لیکن اس وقت اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس کے بالکل قریب کھڑا ہنس رہا ہو۔ اس کے چہرے میں اس کے دانت بے حد نمایاں تھے۔

گلوریا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور بستر پر گر کر بلک بلک کر رونے لگی۔

جب ماریا کو دفن کیا گیا تو گاریز وہاں موجود تھا۔ گاریز کی موجودگی میں گلوریا کی انگلی کے زخم کی ٹیسیں اور زیادہ ہوتی چلی گئیں۔ یہ تکلیف اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ پادری کی آواز فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ صرف چند لوگ جن میں کاؤنٹ کارلائل، والٹ اور گلوریا کے علاوہ گورکن اور پادری شامل تھے وہاں موجود تھے۔ گاؤں کے چند لوگوں نے انہیں تابوت اٹھائے چرچ یارڈ کی طرف آتے ہوئے دیکھا ضرور تھا لیکن وہ اس جنازے سے یوں دور دور رہے جیسے وہ اس سے خائف ہوں یا پھر جیسے یہ کسی اچھوت کی میت ہو۔

گلوریا کو چکر سا آ گیا۔ رہ رہ کر گاریز کا سرد اور بے حس چہرہ اس کی نگاہوں

میں گھوم رہا تھا۔ وہ گرتے گرتے بچی۔ والٹ نے اسے اپنی بانہوں میں سنبھال لیا۔

وہ دونوں تابوت کو زمین کے گہرے اور تاریک شگاف میں اتارے جانے کا منظر ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ گلوریا سوچ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد قبر کا منہ بند کر دیا جائے گا اور اس کی محبوب ترین سہیلی ہمیشہ کے لئے اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائے گی۔ اس کا دل متلانے لگا۔ ایک بار پھر گاریز کا بھیانک چہرہ اس کے سامنے آگیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے گاریز بڑی عقیدت سے قبر کے سرہانے کھڑا اس کی جانب دیکھے جا رہا ہو۔ پھر جیسے گاریز کی آنکھوں میں شیطانیت اور خباثت رقص کرنے لگی اور وہ اس کی طرف شہوانی نظروں سے دیکھنے لگا۔

درد کی ایک لہر گلوریا کے بازو میں ابھری اور اسے بے چین کرنے لگی۔ گلوریا نے دیکھا کہ اس کی انگلی سے خون بہہ کر نیچے گر رہا تھا۔

گلوریا نے خود کو حالات کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ اسے شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ ماریا یقیناً" انہی حالات کا شکار ہو گئی تھی۔ لیکن اس کا اپنا معاملہ دوسرا تھا۔ وہ اتنی آسانی سے شکست تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ یہ صحیح تھا کہ اس کی انگلی زخمی ہو گئی تھی۔ لیکن یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات بھی نہیں تھی۔ تابوت پر مٹی بکھیر دی گئی تھی۔ گلوریا آگے بڑھی اور خاک کی ایک مٹھی اٹھا کر تابوت پر ڈال دی۔ مٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تابوت کی صندلی لکڑی پر بغیر کسی آواز کے لڑھکنے لگے اور وہ سب قبر کے پاس سے ہٹ کر دعائیں پڑھتے ہوئے واپس لے جانے کے لئے مڑ گئے۔

جونہی وہ لوگ چرچ یارڈ کے گیٹ کے قریب پہنچے۔ وہاں کھڑے کچھ لوگ واپس چلے گئے۔ پادری بڑبڑایا۔ "یہ لوگ کس قدر سنگدل اور بے حس ہو گئے ہیں۔"

کاؤنٹ کارلائل نے خوشدلی سے سر ہلایا اور پادری سے کہا۔ "فادر۔ میں آپ سے ایک درخواست کروں گا۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس قیمتی کتابوں کا ایک نادر ذخیرہ ہے۔ کیا میں آپ کی لائبریری میں کچھ وقت گزار سکتا ہوں۔"

پادری نے کاؤنٹ کارلائل کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ "کیا آپ

کی لائبریری میں جادو اور کالے جادو سے متعلق بھی کتابیں موجود ہیں؟" کاؤنٹ کارلائل نے پوچھا۔

"آپ ایک سائنس دان ہیں۔ یہ باتیں آپ کو زیب نہیں دیتیں۔" پادری نے بے یقینی کے عالم میں کہا۔

"یہ صحیح ہے لیکن میں اس شعبے میں بھی اپنی معلومات میں گرانقدر اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔" کاؤنٹ کارلائل نے کہا۔

گلوریا کی ٹانگیں اب جواب دے رہی تھیں۔ وہ زیادہ دیر کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ زمین پر گرنے والی تھی کہ والٹ نے اسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا اور سہارا دیئے ہوئے مکان کی طرف لے گیا۔

☆○☆

دروازے کی چرچراہٹ سن کر والٹ اٹھ بیٹھا۔ کاؤنٹ کارلائل کا انتظار کرتے کرتے وہ تھک کر سو گیا تھا۔ جب وہ سو کر اٹھا تو کمرے میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے ٹٹول کر لیمپ تلاش کیا۔ اس دوران پادری اور کاؤنٹ کارلائل اندر آ چکے تھے۔ جونہی کمرے میں لیمپ کی مدھم روشنی پھیلی' کاؤنٹ کارلائل نے والٹ سے پوچھا۔ "والٹ کیا تم نے کبھی ووڈو کے بارے میں سنا ہے؟"

"ہاں۔ یہ غالباً" غرب الہند کے علاقے کی جادوگری کہلاتی ہے۔"

کاؤنٹ کارلائل نے کہا۔ "اصل میں یہ وہاں کے جزیرے ہائٹی کا خاص تحفہ ہے۔ قدیم روایتی انداز کا جادو۔ لیکن اس سے فرار ممکن نہیں۔"

"غالباً" آپ اس مسئلے پر مجھ سے زیادہ بہتر روشنی ڈال سکتے ہیں۔" والٹ نے کہا۔

کاؤنٹ کارلائل نے اثبات میں سر ہلایا اور کرسی گھسیٹ کر والٹ اور پادری کے قریب بیٹھ گئے۔ "تمہیں یاد ہو گا کہ گلوریا نے ہمیں بتایا تھا کہ اس نے اس رات کسی لاش' مردے یا مافوق الفطرت چیز کو ماریا کو بازوؤں میں اٹھائے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ غیر فطری سی چیز کیا ہو سکتی ہے؟ کوئی بھوت' ہیولا' بد روح' یا پھر کوئی

چلتی پھرتی لاش۔ یہی نہیں بلکہ مارٹی کا بھی یہی کہنا ہے کہ اس نے جنگل میں جس چیز کو دیکھا وہ کوئی اور نہیں' اس کا بھائی تھا جسے وہ خود اپنے ہاتھوں سے دفن کر کے آیا تھا۔"

والٹ نے کہا۔ "یہ تو ہم سب ہی جانتے ہیں کہ مارٹی کا بھائی مرچکا تھا۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ ابھی مرا نہ ہو اور بعد میں جب اسے ہوش آیا ہو تو وہ تابوت سے نکل کر باہر جنگل میں چلا گیا ہو۔" اس نے قیاس آرائی کی۔

کاؤنٹ کارلائل نے حیرت اور غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم کس قدر احمقانہ باتیں کر رہے ہو۔ تم نے خود اس کی موت کی تصدیق کی تھی اور یہی نہیں بلکہ اس دن جب وہ سڑک کے کنارے گرے ہوئے تابوت میں سے لڑھک کر باہر جا گرا تھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کی جسمانی حالت کسی طرح بھی ایک مردے سے کم نہیں تھی۔ تم غالباً خود اپنی بات کی نفی کر رہے ہو۔"

والٹ پادری کی طرف مڑا۔ "فادر۔ آپ کے خیال میں پھر وہ کون ہو سکتا ہے۔ یہ سب کیا ہے؟؟"

کاؤنٹ کارلائل نے بات کاٹی۔ "میرے خیال میں اسی گاؤں کا کوئی فرد جادو کی ان شعبدہ بازیوں میں مگن ہے اور اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ جھاڑیوں اور جنگلوں میں گھومنے والے یہ عفریت مردے ہیں۔ چلتے پھرتے مردے۔ زندہ لاشیں۔"

والٹ حیرت سے منہ کھولے کاؤنٹ کارلائل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "اور آپ ایک باشعور سائنس دان ہونے کے باوجود ان سب مہمل باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔"

"ہاں۔ میں ایک سائنسدان ضرور ہوں۔" کاؤنٹ کارلائل نے اعتراف کیا۔ "لیکن باتیں مہمل ہرگز نہیں ہیں۔ تم جانتے ہو کہ میں کبھی کسی ثبوت یا دلیل کے بغیر کسی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا اور اب تمام شہادتیں میرے سامنے ہیں۔"

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" والٹ اور پادری نے یک زبان ہو کر کہا۔

"مارٹی کے بھائی کے متعلق فی الوقت کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے تو ماریا کی فکر

کھائے جا رہی ہے۔" کاؤنٹ کارلائل نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ماریا۔" والٹ نے کہا۔ اس کے دل و دماغ میں پھر سے ماریا کا نام گونجنے لگا۔ ماریا --- جسے وہ خود اپنے ہاتھوں سے منوں مٹی تلے دبا کر آیا تھا۔ اس کے دل میں خوف اور دکھ کی ایک لہر سی جاگی۔ اس نے بے چینی سے کاؤنٹ کارلائل سے پوچھا۔ "آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"خدا کرے میرے اندیشے غلط ہوں۔ لیکن ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ میں اور پادری صبح ہونے تک اس کی قبر پر پہرا دینے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔" کاؤنٹ کارلائل نے والٹ کو دلاسا دیا۔

والٹ بضد تھا کہ وہ بھی ان دونوں کے ہمراہ قبر پر جائے گا۔ لیکن کاؤنٹ کارلائل چاہتے تھے کہ وہ کسی صورت بھی گلوریا کو تنہا نہ چھوڑے۔ اس کے باوجود والٹ نے ان کی ایک نہیں سنی اور ان کے ہمراہ چرچ یارڈ کی طرف چل دیا۔

☆O☆

قبرستان میں بالکل خاموشی تھی۔ کہیں کہیں اکا دکا قبر پر چھوٹے چھوٹے پھول پڑے ہوئے تھے۔ ماریا کی تازہ قبر پر پھولوں کا ایک بڑا سا انبار نظر آ رہا تھا۔ قبر کے سرہانے ایک بڑا سا پھولوں کا گلدستہ رکھا تھا۔ والٹ نے گلدستہ اٹھایا۔ اس پر ایک کارڈ رکھا ہوا تھا جس پر گاریز کے دستخط موجود تھے۔ والٹ نے دل ہی دل میں گاریز کو ڈھیر ساری گالیاں دیں۔ اس لئے نہیں کہ اس نے اسے یا ایلس کو کبھی کوئی گزند پہنچائی تھی بلکہ اس لئے کہ اسے نہ معلوم کیوں گاریز سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ وہ اس سے شدید نفرت کرتا تھا۔ اسے گاریز' گاؤں اور ماریا کا خیال آیا اور اس کے دماغ میں گزرے ہوئے دن فلم کی طرح چلنے لگے۔ اسے رہ رہ کر اپنے مریضوں کا خیال آ رہا تھا۔ گاؤں کے ایک مکان میں کوئی بیمار بچہ یا بوڑھی عورت' یا کوئی حاملہ عورت اس کی آمد کے منتظر تھے۔ لیکن اس نے ان سب خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اسے ہر قیمت پر یہاں رہنا تھا' اور یہ اس کا آخری فیصلہ تھا۔

کاؤنٹ کارلائل نے ایک قبر کے کتبے سے ٹیک لگا لی اور پاؤں پسار کر بیٹھ گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے وقت چلتے چلتے رک گیا ہو۔ دور چرچ کے گھنٹے نے ایک

بجایا۔ رات کے سناٹے میں یہ آواز دور تک گونجتی چلی گئی۔ رات کے دو بجتے بجتے ہر طرف ویرانی اور خاموشی کا راج ہو گیا۔ کاؤنٹ کارلائل والٹ کے نزدیک بیٹھے ہوئے تھے۔ ان تینوں کی آنکھیں بدستور ماریا کی قبر پر جمی ہوئی تھیں۔ کاؤنٹ کارلائل نے کئی بار والٹ سے کہا کہ وہ گھر جا کر آرام کر لے لیکن وہ ان کے قریب ہی بیٹھے رہنے پر مصر رہا۔

"فادر میرا خیال ہے رات بہت بیت چکی ہے۔ اب آپ کچھ دیر کے لئے چرچ میں جا کر آرام کر لیجئے۔ آپ کی عمر کے لحاظ سے یہ ڈیوٹی خاصی مشکل ہے۔" کاؤنٹ کارلائل نے تجویز پیش کی۔

پادری جو خود بھی بری طرح تھک چکا تھا' اپنی جگہ سے اٹھا اور یہ کہتا ہوا کہ اگر ایسی ویسی کوئی بات ہو جائے تو وہ اسے فوراً" جگا دیں' چرچ کی طرف بوجھل قدموں سے چل پڑا۔

پادری چلتا ہوا چرچ کی دیوار کے ساتھ ساتھ دور اندھیرے میں گم ہو گیا۔ رات کی تاریکی میں یکایک دور ایک چیخ ابھری جس نے کاؤنٹ کارلائل اور والٹ کو بری طرح خوف زدہ کر دیا۔ چیخ ایک بار پھر ابھری۔ اس بار کاؤنٹ کارلائل نے کہا۔

"یہ تو پادری کی چیخ ہے۔ وہ ہمیں مدد کے لئے پکار رہا ہے۔"

یہ سن کر والٹ بھی اٹھ کھڑا ہوا اور وہ دونوں تیزی سے بھاگتے ہوئے چرچ کی طرف چل پڑے۔ تھوڑی دور جا کر انہوں نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا کہ پادری زمین پر پڑا ہوا کراہ رہا ہے۔ پھر دور تاریکی میں کسی کے بھاگنے کی آواز سنائی دی۔

"مجھ پر اچانک کسی نے حملہ کر دیا تھا۔" پادری نے کراہتے ہوئے کہا۔

"کون تھا؟ کون تھا وہ؟ کیا تم نے اس کی صورت دیکھی تھی؟" کاؤنٹ کارلائل نے پوچھا۔ جواب نفی میں تھا۔

کاؤنٹ کارلائل اور والٹ نے سہارا دے کر پادری کو سنبھالا اور اسے لے کر آہستہ آہستہ چرچ کی طرف چل پڑے۔ پادری نے خود کو ان سے چھڑایا۔ "خدا کے

لئے تم میری فکر چھوڑ دو۔ جاؤ وہاں جا کر ماریا کی نگہداشت کرو۔ کہیں یہ سب کوئی چال ہی نہ ہو۔"

والٹ کے دل میں بھیانک وسوسے جنم لینے لگے۔ اسے اچانک خیال آیا کہ ان کے آنے کے بعد ماریا کی قبر کی نگرانی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ تیزی سے چرچ یارڈ کی طرف واپس دوڑے۔ قبر کے نزدیک پہنچنے سے پہلے ہی انہوں نے دیکھا کہ دور مٹیالی روشنی میں ایک لمبا سا آدمی قبر پر جھکا ہوا تھا۔ رات کی پراسرار اور ہولناک تاریکی میں اس ہیولے کی جسامت کو دیکھ کر والٹ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ان کی غیر موجودگی میں کسی نے بری طرح افراتفری میں قبر کو کھود ڈالا تھا۔ ہر طرف مٹی اور پھول بکھرے ہوئے تھے اور تابوت قبر کے باہر پڑا ہوا تھا۔ ایک آدمی تابوت پر جھکا ہوا تابوت کا ڈھکنا کھولنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔

والٹ خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ نفرت' غم اور غصے سے وہ چیخا اور تیزی سے آگے بڑھا۔

وہ آدمی سیدھا کھڑا ہو گیا۔ چاند کی زرد روشنی میں والٹ نے دیکھا کہ وہ ریشمی لبادہ پہنے ہوئے تھا اور چہرے پر سیاہ رنگ کی نقاب اوڑھ رکھی تھی۔ وہ کوئی اور نہیں' گاریز تھا۔

تابوت ان کے سامنے کھلا پڑا تھا۔ لیکن گاریز تیزی سے جھاڑیوں میں جا کر غائب ہو گیا۔ والٹ کو حوصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ تابوت میں جھانک کر دیکھے۔ اسے یقین تھا کہ ماریا تابوت میں موجود ہے۔ لیکن وہ نہ معلوم کیوں تابوت میں جھانک کر دیکھنے سے خائف تھا۔ کاؤنٹ کارلائل کسی اور ہی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ وہ تابوت کے قریب کھڑے کاؤنٹ کارلائل کے پاس جا کھڑا ہوا۔

ماریا کا چہرہ سیدھا تھا۔ اس کے ہاتھ اس کے سینے پر بندھے ہوئے تھے اور اس کی بری بڑی غلافی آنکھیں بند تھیں۔

پھر یکایک ماریا نے آنکھیں کھول دیں۔ یہ ایک خوفناک منظر تھا۔ والٹ بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ پھر جیسے اس کی ساری جان کھنچ کر اس کی آنکھوں میں آ گئی۔ ماریا کے چہرے سے تمام دلکشی اور رونق رخصت ہو چکی تھی

اور اس کی جگہ ویرانی اور ہولناک وحشت نے لے لی تھی۔ یکایک والٹ کو احساس ہوا کہ یہ ماریا کی آنکھیں نہیں تھیں۔ یہ اس کی بیوی کی نہیں بلکہ کسی بھیانک عفریت، کسی لاش کی آنکھیں تھیں۔ والٹ کی نگاہوں میں جیسے سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ وہ ہپناٹائز ہوچکا تھا۔ وہ کسی صورت اپنی آنکھیں ماریا کی آنکھوں پر سے نہیں ہٹانا چاہتا تھا۔

یکایک کاؤنٹ کارلائل چیخے۔ "ہٹ جاؤ۔ خدا کے واسطے اس سے دور رہو۔"

پھر کاؤنٹ کارلائل نے والٹ کو زور کا دھکا دیا۔ والٹ گرتے گرتے بچا۔
ماریا کی لاش آہستہ آہستہ اٹھ کر اپنے تابوت سے باہر آ رہی تھی۔ اس نے اپنے بھیانک بازو پھیلا رکھے تھے۔ اس کی استخوانی کلائیاں والٹ کو اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کے لئے بیتاب نظر آ رہی تھیں۔ وہ بدستور والٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔
والٹ بے حس و حرکت ایک قبر کے کتبے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کے پاؤں جواب دے گئے تھے۔ ماریا کی آنکھوں سے بھیانک مستی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی جیسے کوئی بلی دبے پاؤں اپنے بے بس شکار کی طرف بڑھتی ہے۔

"زندہ لاش ---- وہ مردہ ہے۔" کاؤنٹ کارلائل ہذیانی انداز میں چیخے۔
ماریا نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت عود کر آئی۔ پھر وہ والٹ کی طرف دیکھ کر بے حد مکروہ انداز میں مسکرائی۔ والٹ کا دم گھٹنے لگا۔
خوف کی شدت کے باعث اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ بھاگنے والے آدمی نے ایک پھاؤڑا قبر کے کنارے چھوڑ دیا تھا۔ کاؤنٹ کارلائل جھکے اور اپنی پوری قوت سے وہ پھاؤڑا مٹی سے نکال لیا۔ وہ اپنی مدافعت کے لئے پوری طرح تیار تھے۔
ماریا اب آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ انہیں دبوچ لینے کے لئے بے چین نظر آ رہی تھی۔ جونہی وہ اپنے دونوں بازو پھیلائے آگے بڑھی، والٹ چیخا۔ "نہیں۔ نہیں۔"
اس نے دیکھ لیا تھا کہ کاؤنٹ کارلائل پھاؤڑا اٹھائے ماریا پر حملہ کرنے کے

لئے بالکل تیار کھڑے ہیں۔ ماریا ایک بار پھر مسکرائی۔ کاؤنٹ کارلائل نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ قابل نفرت مسکراہٹ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ان کے جسم میں سردی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ماریا ان کا تمسخر اڑا رہی ہو۔

"مردہ ---- زندہ لاش۔" کاؤنٹ کارلائل بے ربط انداز میں چیخے۔ تیز دھار کا پھاؤڑا پوری قوت سے اٹھایا اور گھما کر ماریا کی گردن پر دے مارا۔
والٹ نے ایک دلخراش چیخ ماری۔ وہ اپنی آنکھیں بند کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں پھر بھی کھلی رہیں۔ پھاؤڑا تلوار کی طرح ماریا کی گردن میں اتر گیا۔ ماریا کی گردن کٹ گئی اور سر کٹ کر شانوں پر جھولنے لگا۔ کاؤنٹ کارلائل نے ایک بار پھر پھاؤڑا گھمایا۔ اور اس بار ماریا کی گردن کٹ گئی۔ اس کا سر کافی دور تک قبروں کے پتھروں سے ٹکراتا لڑھکتا رہا۔ پھر دور ایک قبر کے گڑھے میں جا گرا۔
کاؤنٹ کارلائل اپنی جگہ کھڑے لڑکھڑا رہے تھے۔ پھر انہوں نے پھاؤڑا مٹی میں گاڑ دیا اور تھر تھر کانپنے لگے۔

والٹ نے دیکھا کہ ماریا کا بغیر سر کا دھڑ چند لمحے زمین پر کھڑا رہا۔ پھر دھڑام سے مٹی میں جا گرا۔ خون کا فوارہ ابل ابل کر اردگرد کی گھاس کو سرخ کرنے لگا۔
والٹ آگے بڑھا۔ اسے تمام قبریں کسی مردے کے بھیانک جبڑوں اور ان کے پتھر اور کتبے دانتوں کی مانند نظر آنے لگے۔ قبرستان میں چاروں طرف موت کا بھیانک سناٹا طاری ہو گیا اور اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔ اس پر ایک عجیب سی جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ ہر طرف خون ہی خون بکھرا ہوا تھا اور خوف اور ویرانی کا راج تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر کاؤنٹ کارلائل کے بازوؤں میں پناہ لی۔ وہ خوف سے بری طرح لرز رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں طوفان برپا تھا۔ پھر اس نے خود کو کاؤنٹ کارلائل کے بازوؤں سے چھڑایا اور گھاس میں ماریا کا سر تلاش کرنے لگا۔
وہ جلد سے جلد ماریا کا سر تلاش کر کے اسے اس کے دھڑ کے ساتھ جوڑ دینا چاہتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اگر ذرا سی بھی دیر ہو گئی تو کام خراب ہو جائے گا۔ اسے رہ

رہ کر خیال آ رہا تھا کہیں وہ سر غلط نہ جوڑ دے۔ اگر ایسا ہوا تو میڈیکل سائنس اسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔

وہ پاگلوں کی طرح ادھر ادھر بھاگتا پھر رہا تھا۔ ماریا کا سر تلاش کرتے کرتے وہ بری طرح ہانپنے لگا تھا۔ یکایک اس کی نظر سامنے ایک قبر پر پڑی۔ قبر کا منہ کھل رہا تھا۔ ایک استخوانی ہاتھ قبر کے کنارے پر نمودار ہوا۔ پھر ایک لاش باہر نکل آئی۔ یکے بعد دیگرے قبروں کے دہانے کھلتے گئے اور اپنے تابوتوں سے مردے باہر آنے لگے۔ ان کے چہروں پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ چاند کی روشنی میں ان کی بے نور آنکھیں بے حد وحشت انگیز لگ رہی تھیں۔ قبروں کی زمین جگہ جگہ سے شق ہو رہی تھی اور مردے باہر آ رہے تھے۔

یہ منظر اس قدر ہولناک تھا جیسے قیامت آ گئی ہو۔ ہر طرف کفن میں ملبوس زندہ لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ ان کا ہجوم بڑھنے لگا۔ پھر وہ سب ایک مردے کی قیادت میں کاؤنٹ کارلائل اور والٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ سب گرتے پڑتے' ادھر ادھر قدم رکھتے بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے شکار کی تلاش میں قبروں سے باہر آ گئے تھے اور اب دندناتے پھر رہے تھے۔

یکایک ان میں سے ایک مردے نے جھک کر زمین پر سے کوئی چیز اٹھالی۔ یہ ماریا کا سر تھا۔ ابھی تک ماریا کی گردن سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس کی آنکھیں خوفناک انداز میں کھلی ہوئی تھیں۔ ایک طویل القامت مردے نے سر اپنے ہاتھوں میں اٹھالیا۔ وہ ماریا کے سر کی طرف دیکھ کر ہولناک انداز میں مسکرایا۔ اس کی خوفناک مسکراہٹ کا وحشت خیز ردعمل ہوا۔ جواب میں ماریا کا کٹا ہوا سر بھی اسی طرح مسکرایا۔

والٹ نے ایک دلدوز چیخ ماری۔ اب یہ سب کچھ اس کے لئے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا کلیجہ درد اور خوف کی شدت سے پھٹا جا رہا ہو۔ وہ چاہتا تھا اس قدر چیخے' اس قدر شور مچائے کہ اس کا کلیجہ درد اور خوف کی شدت سے باہر آ جائے۔ مردے بڑے کھوکھلے انداز میں ہنس رہے تھے۔ ان کے

شور سے کان پھٹے جا رہے تھے۔

وہ پھر بے حد زور سے چیخا۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے لالٹین کی زرد روشنی کا ہالہ لہراتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس نے پہلے تو آنکھیں بند کر لیں پھر کاؤنٹ کارلائل کی سکون بخش آواز سن کر آنکھیں کھول دیں۔

"والٹ خدا کے لئے ہوش میں آؤ۔ تم نے ایک بھیانک خواب دیکھا ہے۔ تم ٹھیک ہو۔" کاؤنٹ کارلائل نے اس کے شانے تھپتھپائے۔

اب والٹ نے بستر کی سلوٹ محسوس کرتے ہوئے اپنے دل کو ڈھارس دی۔ وہ اپنے گھر پر ہی تھا۔ "اف خدایا۔ تو گویا یہ سب کچھ ایک خوفناک خواب تھا۔" والٹ نے اطمینان کی سانس لی۔ اس نے تقریباً" چیختے ہوئے کہا۔

"اگر یہ سب کچھ اور کچھ نہیں محض ایک ہولناک خواب تھا تو ماریا کا کیا ہوا۔ میں نے اسے خود اپنی گناہگار آنکھوں سے تابوت سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اف میرے خدا۔ وہ کس قدر خوفناک لگ رہی تھی۔" اس نے کاؤنٹ کارلائل کا ہاتھ پکڑ لیا اور انہیں جھنجھوڑتا ہوا بولا۔ "کیا آپ نے واقعی اسے مار ڈالا؟"

کاؤنٹ کارلائل نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تمہارے خواب کا یہ حصہ بالکل سچ ہے۔ واقعی ماریا اپنے تابوت سے باہر آ گئی تھی اور میں نے اسے مار ڈالا۔ لیکن اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ اب وہ ہمیشہ کی پرسکون نیند سو چکی ہے۔ اسے ایک نئے تابوت میں دفن کر دیا گیا ہے' اور ہاں آخری رسومات ادا کرنے سے پہلے پادری نے اس کی روح کو آسیب کے اثر سے پاک کر دیا تھا اور اب تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب کوئی بدروح ماریا کو پریشان نہیں کر سکے گی۔"

والٹ نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن جو بھیانک خواب میں نے دیکھا' میں اس کی تفصیل آپ کو ضرور بتانا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے قسم کھا کر کہتا ہوں یہ خواب حقیقت سے اس قدر قریب تھا کہ اس کے تصور سے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجھے یقین سا ہو گیا ہے کہ یہ خواب نہیں ایک حقیقت تھی۔"

کاؤنٹ کارلائل نے والٹ سے دریافت کیا کہ اس نے کیا دیکھا تھا اور پوری توجہ سے اس کی بات سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گئے۔

"میں نے دیکھا کہ قبرستان کی ہر قبر پھٹ گئی اور مردے اپنی قبروں سے نکل کر باہر آ گئے۔ ہر تابوت' ہر قبر بالکل خالی ہو گئی تھی اور چاروں طرف یہ زندہ لاشیں آزادانہ گھوم رہی تھیں۔ اف خدایا۔ یہ کس قدر وحشت انگیز اور خوفناک منظر تھا۔" والٹ نے خوف سے لرزتے ہوئے کہا۔

☆○☆

سارجنٹ اور اس کے ساتھی حیران کن نگاہوں سے خالی تابوتوں اور قبروں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اب تک دس قبریں کھود کر دیکھ چکے تھے۔ لیکن وہ سب خالی تھیں۔ خالی تابوت ان کا منہ چڑا رہے تھے۔

"جناب آخر یہ سب کہاں چلے گئے۔ یہ عفریت خدا معلوم اب گاؤں والوں پر اور کیا ستم ڈھائیں گے۔" سارجنٹ نے لجاجت سے کہا۔

کاؤنٹ کارلائل نے تباہ شدہ چرچ یارڈ کی طرف دیکھا اور پھر سارجنٹ اور اس کے ساتھیوں کو قبریں پاٹنے کا حکم دے کر وہاں سے چلنے کا ارادہ کرنے لگے۔ پھر انہوں نے سارجنٹ سے کہا کہ وہ ہر قیمت پر مارٹی سے گفتگو کرنے کے خواہشمند ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ان مردوں کو کسی اور جگہ تلاش کرنے سے قبل مارٹی سے ان کی منزل کے بارے میں یقیناً کوئی امید افزا بات معلوم ہو سکتی تھی۔ وہ لوگ واپس پولیس سٹیشن چلے آئے۔ ان کا خیال تھا کہ تھکن دور کرنے کے لئے ایک پیالی چائے سے بہتر کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔

لیکن آرام یا تازہ دم ہونے کی ساری توقعات دھری کی دھری رہ گئیں۔ کیونکہ جب یہ لوگ پولیس سٹیشن میں داخل ہوئے تو وہاں کا حلیہ ہی بگڑا ہوا تھا۔ میز اور کرسیاں الٹی پڑی تھیں۔ عجیب افراتفری کا سماں تھا۔ حوالات کا تالا ٹوٹا ہوا تھا اور راہداری کا فرش ادھڑا پڑا تھا۔

کانسٹیبل چیخا۔ "وہ فرار ہو گیا ہے۔"

کاؤنٹ کارلائل بولے۔ "اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ آخر کہاں چلا گیا۔

کیا وہ بھی دوسرے مردوں میں شامل ہو گیا؟"

سارجنٹ نے پوچھا۔ "آپ کا خیال ہے کہ وہ بھی---"

کاؤنٹ کارلائل نے اس کی بات کاٹی۔ "ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن جلد یا بدیر اس کا انجام بھی ان زندہ لاشوں سے مختلف نہیں ہو گا۔"

کاؤنٹ کارلائل نے کانسٹیبل سے دریافت کیا کہ آیا ان کی غیرموجودگی میں کوئی شخص قیدی سے ملنے تو نہیں آیا تھا۔ کانسٹیبل نے انہیں بتایا کہ ایسی کوئی قابل ذکر بات تو نہیں۔ ہاں البتہ گاریز ضرور اس سے یعنی مارٹی سے ملنے آیا تھا۔ اس نے کہا کہ مارٹی نے اس کا کوئی کام کیا تھا اور وہ اسے اس کا معاوضہ دینے آیا تھا۔

"کیا وہ دونوں صرف باتیں ہی کرتے رہے تھے؟" کاؤنٹ کارلائل نے پوچھا۔

"میں نے ٹھیک سے سنا نہیں۔ لیکن وہ آہستہ آہستہ کوئی بات کر رہے تھے۔" کانسٹیبل بولا۔ "پھر گاریز نے ایک گلاس پانی مانگا۔"

"وہ گلاس کہاں ہے؟" کاؤنٹ کارلائل چیخے۔

"وہ تو پھینک دیا گیا۔" جواب ملا۔

"میں پوچھتا ہوں اسے پھینکنے کی کیا ضرورت تھی؟" کاؤنٹ کارلائل کے دل میں وسوسے سر اٹھانے لگے۔

"جناب گلاس گاریز کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا تھا۔" کانسٹیبل نے سردمہری سے کہا۔

"مارٹی ضرور اسی ٹوٹے ہوئے گلاس سے زخمی ہوا ہو گا۔" کاؤنٹ کارلائل نے قطعی طور پر کہا۔

کانسٹیبل کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ "لیکن سر۔ آپ کو--- آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟"

کاؤنٹ کارلائل اب کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔ اور وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے۔ اب سب باتیں واضح طور پر سامنے آ رہی تھیں۔ لوگوں کا زخمی ہونا۔ پھر خبیث روحوں کی شیطانیاں۔ گاریز ایک چلتا پھرتا بھیانک کردار بن کر سامنے آ رہا تھا۔ اب کسی نتیجے پر پہنچنا دشوار نہیں تھا۔ کاؤنٹ کارلائل سوچ رہے تھے کہ اس

ذلیل انسان نے نہ معلوم ماریا کو کس طرح زخمی کیا ہو گا۔ ماریا کا خیال آتے ہی انہیں گلوریا کی فکر نے بے چین کر دیا۔ انہوں نے تمام کام فوری طور پر منسوخ کر دیئے اور بغیر کچھ کہے بڑی تیزی سے چوک پار کر کے ڈاکٹر والٹ کے گھر کی طرف لپکے۔

وہ پاگلوں کی طرح راہداری میں داخل ہوئے جو ویران پڑی تھی۔ ایک پریشان حال آدمی کی طرح وہ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے گلوریا کی خواب گاہ تک جا پہنچے اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ گلوریا کا بستر خالی تھا۔ وہ کبھی اپنی زندگی میں اس قدر خوفزدہ نہیں ہوئے تھے جس قدر وہ اس وقت تھے۔ تھکے تھکے مایوس قدموں سے وہ زینہ اتر کر نیچے آ گئے۔

یکایک باورچی خانے سے گلوریا نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی ایک پیالی تھی۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکرانے لگی۔ کاؤنٹ کارلائل نے اطمینان کا سانس لیا اور اس سے والٹ کے بارے میں پوچھا۔

انہیں یہ سن کر صدمہ ہوا کہ والٹ بے حد پریشان ہے اور آب و ہوا کی تبدیلی کی خاطر لندن واپس جانا چاہتا ہے۔ وہ بولی۔ "ڈیڈی ہمیں والٹ کی دلجوئی کی خاطر کچھ کرنا چاہیے۔ وہ اب اس جگہ سے بالکل بیزار ہو چکا ہے۔"

کاؤنٹ کارلائل کو یہ احساس بڑی شدت سے ہوا کہ ان کی بیٹی کیونکہ ایک دوسرے آدمی کی بھلائی اور بہبود کے بارے میں متفکر تھی اس لئے ایسے خطرے کی کوئی بات نہیں تھی کہ اس کے بارے میں فکرمند ہوا جا سکے۔ وہ بڑے مطمئن نظر آنے لگے۔ انہوں نے گلوریا سے پوچھا کہ اب اس کی انگلی کیسی ہے۔ گلوریا نے انہیں بتایا کہ پہلے سے بہتر ہے۔

سر کارلائل باہر جانا چاہتے تھے لیکن وہ گلوریا کو کسی حالت میں تنہا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ایک انجانا سا خوف ان کے دل پر مسلط تھا۔ والٹ کے آتے ہی وہ اس سے مخاطب ہوئے۔ "والٹ' میں چاہتا ہوں تم میرے لئے ایک ذرا سی زحمت کرو۔ میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں گا۔ وعدہ کرو کہ تم کبھی گلوریا کو اکیلا نہیں چھوڑو گے۔ بتاؤ کیا تم وعدہ کرتے ہو؟" ان کے لہجے میں رقت آمیز لجاجت تھی۔

والٹ نے وعدہ کیا کہ وہ کاؤنٹ کارلائل کی بات کبھی نہیں ٹالے گا۔ کاؤنٹ کارلائل اسے انتظار کرنے کا کہہ کر باہر چلے آئے۔

وہ واپس پولیس سٹیشن گئے۔ وہاں چند پرانے نقشوں کا مطالعہ کیا۔ لندن میں ان کے بہت سے بارسوخ اور بااثر دوست تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ اس تہذیب یافتہ دور میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنے ذاتی مفادات کی خاطر دوسروں کو نقصان پہنچانے اور اذیت دینے کے لئے جادو ٹونے اور سفلی علم سے فائدہ اٹھانے میں کوئی عار نہیں سمجھتے۔ پھر وہ پادری کی لائبریری میں جا پہنچے اور وہاں انہوں نے مزید چند کتابوں کا مطالعہ کیا۔ جب وہ ان کاموں سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو شام کا دھندلکا چھا رہا تھا۔ وہ جنگل کی طرف چل پڑے۔

دور پہاڑی پر واقع گاریز کا مکان بڑا پراسرار دکھائی دے رہا تھا۔ انہیں یہ بات بڑی عجیب سی لگی کہ گاریز جیسا باوقار آدمی ایسے گھناؤنے کاروبار میں ملوث تھا۔ واقعی گاریز کی وجہ سے پورا گاؤں دکھ اور اذیت میں مبتلا ہو گیا تھا اور ان کے خیال میں گاریز کی سزا کم از کم سنگساری تھی۔

جونہی انہوں نے صدر دروازے کی گھنٹی بجائی' ایک تنومند نوجوان نے دروازہ کھولا۔ یہ وہی آدمی تھا جس سے پہلے دن لومڑی کے شکار کے معاملے میں گاؤں میں آتے ہی ان کی مڈبھیڑ ہوئی تھی۔

"میرا خیال ہے ہم اس سے پہلے بھی مل چکے ہیں۔ بہرحال اب اس کا تذکرہ لاحاصل ہے۔ میرا نام کاؤنٹ کارلائل ہے اور میں گاریز سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ میرا پیغام ان تک پہنچا دیں۔ ان سے کہیں کہ میں ان سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا چاہے وہ کتنے ہی مصروف کیوں نہ ہوں۔"

دروازے پر آنے والا نوجوان عیاری سے مسکرایا اور کاؤنٹ کارلائل کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ کاؤنٹ کارلائل نے دیکھا کہ وہ اندر ایک وسیع و عریض شاندار ہال میں کھڑے ہیں۔ نوجوان کے اندر جاتے ہی انہوں نے لپک کر ایک کھڑکی کی چٹخنی کھول دی تاکہ اگر کوئی خطرے والی بات ہو تو وہ آسانی سے فرار ہو سکیں۔ یہ قدم انہوں نے اپنی ڈھلتی ہوئی عمر اور حفظ ماتقدم کے تقاضوں کے پیش نظر اٹھایا

تھا۔ وہ ہر قسم کے غیر متوقع حالات کے لئے خود کو تیار کر چکے تھے۔

چند لمحوں بعد گاریز ہال میں داخل ہوا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بہت جلدی میں ہو اور جلد از جلد کاؤنٹ کارلائل سے پیچھا چھڑا کر بھاگ جانا چاہتا ہو۔

"جی۔ آپ مجھ سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں۔ جلدی کیجئے میرا وقت بے حد قیمتی ہے۔" گاریز نے کہا۔

کاؤنٹ کارلائل نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "مسٹر گاریز۔ فارغ تو میں بھی نہیں ہوں۔ خود مجھے بھی بہت سے کام کرنے ہیں اور میرا وقت تم سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ بہرحال میں تم سے ماریا اور نوجوان مارٹی کے بارے میں ملنا چاہتا ہوں۔ اور ہاں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میری بیٹی کے بازو کے زخم سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

گاریز کی آنکھ کے قریب ایک رگ پھڑکنے لگی۔ اس نے سپاٹ انداز میں کاؤنٹ کارلائل کی طرف دیکھا اور بولا۔ "میرا خیال ہے آپ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

کاؤنٹ کارلائل نے خونخوار نگاہوں سے گاریز کو دیکھا۔ "کاش میں واقعی پاگل ہوتا۔ لیکن میں جانتا ہوں یہ سب کچھ تمہارا کیا دھرا ہے۔"

کاؤنٹ کارلائل جانتے تھے کہ انہیں کسی قیمت پر بھی گاریز کو مدافعت کا موقعہ نہیں دینا ہے۔ انہوں نے کہا۔ "گاریز۔ تم ایک طویل عرصے تک مختلف ملکوں میں رہے ہو۔ تم غرب الہند بھی گئے تھے اور وہاں تم نے مشہور کالے جادو ووڈو کے متعلق بھی بہت کچھ دیکھا اور سیکھا ہے؟؟"

گاریز غصے سے چیخا۔ "آپ جا سکتے ہیں۔ آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔"

کاؤنٹ کارلائل اپنی جگہ کھڑے رہے۔ یکایک انہوں نے دیکھا کہ چھ مشٹنڈے کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں وحشت اور بربریت چھائی ہوئی تھی۔ وہ سب اس وقت شکاری لباس کی بجائے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ کاؤنٹ کارلائل نے بے نیازی سے کندھے اچکائے اور حالات کی نزاکت کے پیش نظر صدر دروازے کی طرف چل دیئے۔

"شب بخیر مسٹر گاریز۔ یقیناً" آپ سے بہت جلد ملاقات ہو گی۔" کاؤنٹ کارلائل نے چلتے چلتے کہا اور دروازہ کھول کر ان نوجوانوں کے تمسخر کو نظر انداز کرتے ہوئے باہر سڑک پر نکل آئے۔

باہر آ کر وہ عمارت کے عقبی حصے کی طرف چلے گئے جہاں انہوں نے کھڑکی کی کنڈی کھول دی تھی۔ چاند نکل آیا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ بڑی خاموشی سے آگے بڑھتے رہے۔ عمارت کے اندر سے اب کوئی آواز نہیں آ رہی تھی اور کسی کے قدموں کی چاپ یا کسی کتے کے بھونکنے کی آواز بھی نہیں تھی۔ انہوں نے بجلی کی سی تیزی سے کھڑکی کھولی اور چپکے سے دوبارہ اندر داخل ہو گئے۔

اس وقت ہال میں چاند کی روشنی کھڑکی کے دریچوں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ کاؤنٹ کارلائل نے دیکھا کہ کوئی سیڑھیوں کے بالائی دروازے سے آ رہا تھا۔ وہ سیڑھیوں کے سائے کی آڑ میں ہو گئے۔

گاریز آہستہ آہستہ نیچے اترا اور سامنے کا دروازہ کھول کر کمرے میں چلا گیا۔ کمرے کے آتشدان میں آگ روشن تھی جس کی ایک جھلک کاؤنٹ کارلائل کو دکھائی دی۔ اس وقت کاؤنٹ کارلائل کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ انہیں حالات کا شکار ہو کر بالکل ہی بے بس ہو جانا پڑے۔ اس طرح ان کا مشن نامکمل رہ جاتا۔ دروازے کی ادھ کھلی روشنی میں کاؤنٹ کارلائل نے اندر کا منظر دیکھا۔

گاریز ایک بار پھر آگ کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے سفید کفن سا لباس پہن لیا تھا اور اب وہ اپنے چہرے پر ایک بھیانک سا ماسک چڑھا رہا تھا۔ آتشدان سے لپکتے ہوئے آگ کے شعلے زہریلے سانپوں کی زبانوں کی طرح اس کی طرف کوند رہے تھے۔

گاریز ایک بوسیدہ سی میز کے قریب گیا اور ایک دراز کھول کر کپڑے کی ایک چھوٹی سی گڑیا نکالی۔ گڑیا اپنے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے وہ کچھ بڑبڑانے لگا۔ پھر اس نے دراز بند کر دیا اور کمرے میں بیتابی سے ٹہلنے لگا۔ کاؤنٹ کارلائل کا خیال تھا کہ وہ پھر دروازے سے باہر آئے گا لیکن وہ نہ معلوم کہاں چلا گیا تھا۔ کاؤنٹ

کارلائل نے کافی دیر انتظار کیا۔ لیکن طویل انتظار اب ان کے اعصاب کے لئے جان لیوا ثابت ہو رہا تھا۔ آخر ان سے نہ رہا گیا۔ وہ تیزی سے دروازہ کھول کر نتائج کی پرواہ کئے بغیر کمرے میں داخل ہو گئے۔

گاریز کمرے میں نہیں تھا۔ کاؤنٹ کارلائل دبے پاؤں میز کے قریب گئے اور اوپر کا دراز کھولا۔ دراز خالی تھا لیکن دوسرا دراز بھرا ہوا تھا۔ اس میں لکڑی کے چھوٹے چھوٹے تابوت رکھے ہوئے تھے اور ہر تابوت میں ایک خون آلود گڑیا کا پتلا رکھا ہوا تھا۔ انہیں گننے کی ضرورت اور فرصت نہیں تھی۔ یہ پتلے یقیناً" گاؤں کے ان مردہ لوگوں کے تھے جن کی بے چین روحیں اب گاؤں والوں کے لئے عذاب بن کر رہ گئی تھیں۔ یہ سب اب گاریز کے رحم و کرم پر تھے۔ اس کے شکنجے میں تھے۔ اور وہ ان سے جس طرح اور جب جی چاہے کام لے سکتا تھا۔ یہ سب لاشیں اب اس کی غلام تھیں اس نے روحوں کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔

کمرے کے ایک کونے میں انہیں ایک پرانا سا بیگ نظر آیا۔ انہوں نے وہ بیگ اٹھا کر میز پر رکھا اور دراز کھول کر تمام پتلے جلدی جلدی بیگ میں بھر لیے۔ دروازہ چرچرایا۔ وہ رک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ آگ کی روشنی میں پورا کمرہ سرخ ہو رہا تھا اور ماحول بے حد پراسرار نظر آ رہا تھا۔

یکایک دروازہ ایک زوردار آواز کیساتھ کھلا اور دروازے میں انہیں ایک نوجوان نظر آیا جو بڑی سنگدلی اور مکاری سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سرخ رنگ کا بھڑکیلا لباس پہنے ہوئے تھا اور اس کا چہرہ شعلوں کی روشنی میں بھیانک انداز میں نیلا نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوفناک تیز دھار تلوار تھی اور اس کے ارادے ہولناک نظر آ رہے تھے۔

کاؤنٹ کارلائل تیزی سے ایک طرف ہٹ گئے۔ نووارد بجلی کی طرح ان کے پیچھے آیا۔ اس کی تلوار لکڑی کی میز کو چاٹتی ہوئی نکل گئی۔ وہ پھر پلٹا اور دوبارہ حملہ کیا۔ کاؤنٹ کارلائل اس دوران خود کو اس خوفناک لمحے سے بچانے کے لئے مستعد کر چکے تھے۔ تلوار آگ کے شعلوں میں ایک بار پھر چمکی اور نوجوان بڑی درندگی اور سفاکی سے مسکراتے ہوئے پھر آگے بڑھا۔ اس بار کاؤنٹ کارلائل نے پینترا بدلا

اور اسے جھکائی دے کر صاف وار بچا لیا۔

زندگی اور موت کی اس کشمکش میں کاؤنٹ کارلائل کو اپنی پوری طاقت اور ذہانت کا مظاہرہ کرنا تھا۔ وہ برق رفتاری سے خود کو بچانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ انہوں نے اس بار پوری قوت سے اچھل کر اپنی دونوں ٹانگیں نوجوان کے سینے پر ماریں۔ نوجوان اپنا توازن کھو بیٹھا اور تیورا کر گرا۔ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ وہ دونوں اب فرش پر گتھم گتھا ہوئے پڑے تھے اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کی سرتوڑ کوششوں میں مصروف تھے۔

کاؤنٹ کارلائل تابڑتوڑ انداز میں نوجوان کے جبڑوں پر گھونسے مار رہے تھے۔ لیکن وہ بے حد سخت جان اور طاقتور آدمی تھا۔ جونہی وہ کاؤنٹ کارلائل کی گرفت سے آزاد ہوا وہ تیزی سے تلوار کی طرف لپکا۔ کاؤنٹ کارلائل نے اس کی ٹانگیں پکڑ لیں اور وہ ایک بار پھر اوندھے منہ فرش پر جا گرا۔

یہ خونی کھیل ابھی جاری تھا کہ کمرے کا دروازہ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ بند ہو گیا۔ کاؤنٹ کارلائل نوجوان کے سینے پر سوار ہو گئے۔ اب ان کی آنکھوں میں بھی خون اتر آیا تھا اور وہ مدافعت کے بجائے ہر قیمت پر اسے ہلاک کر دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے بمشکل تمام ہاتھ بڑھا کر تلوار اٹھائی اور اپنی پوری قوت سے وار کیا۔ ان کا وار بے حد مہلک اور موثر ثابت ہوا۔ نوجوان کی گردن سے خون کا ایک فوارہ ابل پڑا اور وہ فرش پر بری طرح تڑپنے لگا۔ اس کے نرخرے سے عجیب سی آوازیں آ رہی تھیں۔

کاؤنٹ کارلائل نے تلوار ایک بار پھر اٹھائی اور ایک وار اور کیا۔ اس بار نوجوان زور سے تڑپا اور خون کے سمندر میں لوٹتا ہوا لڑھک کر آتشدان کے قریب جا گرا۔ کاؤنٹ کارلائل نے بیگ سنبھالا اور دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازہ باہر سے بند ہو چکا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح تمام دیواریں ٹٹولنے لگے۔ انہیں کہیں کوئی چور دروازہ نظر نہ آیا۔ کسی طرف کوئی چٹخنی یا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کاؤنٹ کارلائل کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

یکایک کمرے میں دھواں سا بھرنے لگا۔ کوئی چیز جل رہی تھی۔ اور پھر گوشت

جلنے کی تیز بو نے کاؤنٹ کارلائل کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لی۔ یہ نوجوان کی لاش جل رہی تھی جو لڑھک کر آگے کے بالکل قریب چلی گئی تھی۔ کاؤنٹ کارلائل کو اب ایک نئی آفت کا سامنا تھا۔

کمرے میں کوئی روشندان بھی نہیں تھا اور کھڑکیوں پر دبیز پردے لٹکے ہوئے تھے۔ انہوں نے پریشانی کے عالم میں ایک پردہ کھینچا اور اسے پھاڑ کر علیحدہ کر دیا۔ کمرے میں گرد اڑنے لگی۔ پھر انہوں نے پردہ اٹھا کر آگ پر ڈال دیا۔ لیکن آگ بجائے سرد ہونے کے اور بھڑک اٹھی اور پردے دھڑا دھڑ جلنے لگے۔ آگ کے شعلے اور بلند ہو گئے اور کمرے میں شدید حبس اور گرمی بڑھنے لگی۔ کاؤنٹ کارلائل دیوانوں کی طرح باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہے تھے۔ لیکن ابھی تک انہیں مایوسی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا۔

انہیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ایک چوہے دان میں بند ہو گئے ہوں۔ موت منہ کھولے ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اور وہ بے بسی سے لاچاری کے عالم میں دروازہ کھولنے کی کاوشوں میں مصروف تھے۔ یکایک انہیں ایک گھنٹی نظر آئی۔ انہوں نے نتائج کی پروا کئے بغیر گھنٹی بجا دی۔

دروازے پر کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ انہوں نے ایک بار پھر زور سے گھنٹی بجائی۔ وہ جانتے تھے کہ اس تپش اور گرمی میں وہ زیادہ سے زیادہ دس یا پندرہ منٹ تک زندہ رہ سکتے تھے۔

آخر دروازہ کھولا گیا۔ وہ دروازے کی اوٹ میں ہو گئے۔ ایک حبشی نژاد ملازم نے دروازہ کھولا اور اندر آگیا۔ کاؤنٹ کارلائل نے بڑی سرعت سے اس کے دونوں بازو اس کی پشت کی جانب جکڑ لئے اور چیخے۔ "گاریز کہاں ہے مجھے اس کے پاس لے چلو۔

ملازم خود کو ان کی گرفت سے آزاد کرانے کے لئے جدوجہد کرنے لگا۔ بڑی مشکلوں کے بعد آخر اس نے زبان کھولی اور کاؤنٹ کارلائل کو بتایا کہ گاریز نیچے تہخانے میں موجود ہے۔ اس نے انہیں بتایا کہ اسے اس تہہ خانے کے راستے کا کوئی علم نہیں کیونکہ صرف گاریز کو ہی اس راستے کا پتہ ہے۔ ہاں ایک راستہ اور اس

تہہ خانے کو جاتا ہے لیکن وہ راستہ کان سے ہو کر گزرتا ہے۔

کاؤنٹ کارلائل اس آدمی کو دھکیلتے ہوئے ہال میں آ گئے۔ ادھر کمرے میں آگ کے شعلوں نے اب قالین کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ نوجوان کی لاش بری طرح جل کر سیاہ اور مسخ ہو چکی تھی اور آگ کے شعلے بڑی تیزی سے میز اور کمرے کی دوسری چیزوں کو جلا رہے تھے۔ پتلوں سے بھرے ہوئے بیگ کے اردگرد بھی آگ ہی آگ تھی۔

کاؤنٹ کارلائل کو گاریز کے خلاف شہادتوں کی ضرورت تھی۔ لیکن آگ کی حدت ناقابل برداشت تھی۔ آگ کی تمازت سے ہال کمرے میں بھی کھڑا ہونا دشوار تھا۔ وقت بہت کم رہ گیا تھا اور اب کاؤنٹ کارلائل کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ بیگ حاصل کر سکیں۔ وہ تیزی سے پلٹے اور ملازم کو سکتے کے عالم میں چھوڑ کر عمارت سے باہر چلے گئے۔

☆○☆

غار میں قربان گاہ کا چبوترا مزید قربانیوں کا منتظر تھا۔

خون کی دھاریاں جو اب چبوترے کے پتھر پر جم کر سیاہی مائل ہو چکی تھی مشعلوں کی روشنی میں سیاہی مائل سرخ لکیروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ سفید چغے میں ملبوس گاریز غار میں سے ہوتا ہوا قربان گاہ تک گیا۔ راستے میں جگہ جگہ مردے بڑے مودب انداز میں کھڑے تھے۔ یہ سب ٹین کی اس کان میں کام کرنے پر مامور تھے۔ وہ ٹین کو لکڑی کی ٹرالیوں میں بھرتے اور غار سے باہر لے جاتے۔ غار کے دہانے پر ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوڑا تھا۔ اگر کسی مردے کو ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو وہ کوڑے مار مار کر اس کی کھال ادھیڑ دیتا تھا۔

ان مردوں کے کفن پھٹ چکے تھے اور کھال جگہ جگہ سے لٹک گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ جانے کتنی صدیوں سے اس بدترین غلامی میں گرفتار ہوں۔ وہ بے بس اور لاچار لاشوں کی طرح چل پھر رہے تھے۔ انہی میں ایک اور نئی لاش کا اضافہ ہو چکا تھا۔ یہ تازہ ترین شکار نوجوان مارٹی تھا جس کے چہرے پر مردنی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ان سب بے جان لاشوں کی طرح بھیانک اور پراسرار نظر آ رہا

تھا۔

گاریز نے اپنے ہاتھوں میں سنبھالی ہوئی کپڑے کی گڑیا اٹھائی اور اسے لے کر قربان گاہ کے چبوترے کی طرف چل پڑا۔ تمام مردے اس کے پیچھے پیچھے ہاتھ باندھے چل رہے تھے۔

فضا میں ڈھول کی آواز ابھرنے لگی۔ ایک پہریدار اپنے ہاتھ میں چابک سنبھالے اپنے آقا کے ساتھ ساتھ تھا۔ گاریز جلد از جلد اس کام کو سرانجام دینا چاہتا تھا۔ موت کا رقص شروع ہوا چاہتا تھا۔

گاریز نے زیر لب جادو کے فقرے بولنے شروع کئے۔ "کاوا۔ توسترا۔ کاوا استرا۔"

دور گاؤں کے ایک مکان میں لیمپ کے قریب بیٹھی سلائی کرتی ہوئی گلوریا نے جھرجھری سی لی اور اس کے سارے بدن میں جیسے آگ سی بھر گئی۔ اس کی پیشانی اور بازو پسینے میں تر ہو گئے۔ وہ جھکی اور آہستہ آہستہ سحرانگیز بول دہرانے لگی۔ "کاوا۔ توسترا۔ کاوا استرا۔"

والٹ جو اس کے قریب بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا' یکایک رک گیا اور پوچھا۔ "گلوریا۔ کیا بات ہے۔ کیا تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟"

گلوریا چونک پڑی اور بولی۔ "نہیں کوئی بات نہیں ہے۔" پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

کمرہ بری طرح گھوم رہا تھا۔ گلوریا کا سر چکرا رہا تھا۔ اسے والٹ کے چہرے پر برستی ہوئی حماقت اور پریشانی دیکھ کر بری طرح ہنسی آ رہی تھی۔ نہ معلوم کیوں اس کی کیفیت بڑی عجیب سی ہو رہی تھی۔ وہ کبھی ہنستی اور کبھی روتی۔ والٹ اس کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا اور کوئی دوا لانے کے لئے فوراً" سیڑھیاں اتر کر اپنی لیبارٹری میں چلا گیا۔

جانے سے پہلے اس نے گلوریا کو اپنے بازوؤں میں سنبھالا اور اسے بڑے آرام سے کاؤچ پر لٹا دیا۔ گلوریا نے آنکھیں بند کر لیں اور اسے یوں لگا جیسے خود اس کے جسم سے ایک عورت نکل کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی ہو۔ خبیث

روحوں کا بلاوا اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ وہ ہر قیمت پر اپنے آقا کے پاس جانا چاہتی تھی۔

والٹ کے باہر جاتے ہی وہ اٹھی اور تیزی سے سیڑھیاں عبور کرتی ہوئی باہر نکل آئی۔ یہ راستہ اس کا جانا پہچانا تھا۔ وہ اس راستے پر پہلے بھی آ چکی تھی۔ گاریز سے ملنے کی خواہش نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔ وہ تیزی سے رات کی تاریکی میں آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا رخ ٹین کی کان کی سمت تھا۔ وہ جلد از جلد گاریز کی آغوش میں کھو جانا چاہتی تھی۔

اس کا آقا اس کا منتظر تھا۔ کچھ دیر بعد جیسے اسے راستہ بھول گیا ہو۔ وہ ایک لمحے کو رکی۔ پھر دور کھڑے مارٹی نے بازو پھیلائے اور تیزی سے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ مارٹی کی آغوش سرد اور بے جان تھی۔ ٹھنڈے گوشت کے لمس نے گلوریا کو ایک عجیب سا سکون بخش دیا۔

مارٹی اسے اپنے بازوؤں میں سنبھالے ہوئے کان کے دروازے سے گزر کر نیم تاریک، عمارت میں لے گیا۔ یہاں ایک لفٹ ان کی منتظر تھی۔ وہ دونوں لفٹ میں بیٹھ کر جلد ہی کان کے تہہ خانے میں پہنچ گئے۔

کان کے تہہ خانے میں بہت سے مردے ان کے گرد جمع ہو گئے۔ گاریز کے مکروہ لبوں پر ایک خبیث مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ گلوریا کو ایسا لگا جیسے آخرکار وہ اپنی منزل تک آ گئی ہو۔

اچانک گاریز نے اپنا بھیانک ماسک اتار دیا اور گلوریا کی نظر اس کے چہرے پر پڑی۔ وہ وحشت زدہ ہو کر زور سے چیخی۔ اس کی چیخ پورے غار میں دیر تک گونجتی رہی۔ جادو کا کھیل یکلخت ختم ہو چکا تھا۔ وہ قابل نفرت انداز میں گاریز کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ جلد از جلد یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ کئی استخوانی ہاتھوں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ فضا میں گاریز اور پہریدار کے ہولناک قہقہے گونجنے لگے اور وہ سب اسے کشاں کشاں قربان گاہ کے چبوترے کی طرف لے چلے۔

ان مردوں نے اپنے آقا کے حکم پر اسے چبوترے پر لٹا دیا اور اسے بے بس

کر دیا۔

گاریز نے سونے کے ایک برتن میں خون سے اپنے ہاتھ دھوئے۔ اور ایک مخملی طشت پر سے جواہرات سے مرصع ایک آبدار خنجر اٹھایا۔ اس دوران ایک مردے نے آگے بڑھ کر گلوریا کے دونوں بازو ریشم کی ایک ڈوری سے اس کی پشت پر باندھ دیئے۔ گلوریا نے خود کو آزاد کرانے کی جدوجہد شروع کر دی۔ لیکن اس کی یہ کوشش بیکار تھی۔ گاریز خنجر اپنے دونوں ہاتھوں میں تولتا ہوا اس کے قریب آ رہا تھا۔

"نہیں نہیں۔ نہیں۔" گلوریا دردناک لہجے میں چیخی۔ دکھ اور کرب سے اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ موت کی دہلیز پر کھڑی تھی اور زندگی دور کھڑی حیرت سے اس کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔

"رک جاؤ۔" ایک گرجدار آواز غار میں گونجی۔ یہ والٹ کی آواز تھی۔

گاریز کا فسوں ٹوٹ گیا۔

وہ غصے سے اپنے ہاتھ ملنے لگا۔ اس نے مردوں کی طرف ایک مبہم سا اشارہ کیا۔ چاروں طرف سے مردے والٹ پر ٹوٹ پڑے اور اسے جکڑ لیا۔ وہ خود کو ان کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ گاریز چند لمحے تک والٹ کی طرف خونخوار نظروں سے دیکھتا رہا پھر گلوریا کی طرف مڑا۔

یکایک غار میں تیز روشنی پھیل گئی۔ یہ قربانی کی رسم کا ایک حصہ نہیں تھا۔ اوپر کمرے میں بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں نے تہہ خانے کی چھت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور آگ کے شعلے نیچے غار میں اتر رہے تھے۔ ہر طرف ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ مردوں کے جسموں پر جیسے کسی نے پٹرول چھڑک دیا ہو۔ ان کے جسم دھڑا دھڑ جل رہے تھے۔ غار میں ہر طرف جلتے ہوئے گوشت اور کپڑوں کی تیز بو پھیل گئی۔

آگ بڑھتی جا رہی تھی اور ہر طرف ایک قیامت کا سماں تھا۔ والٹ نے اس افراتفری سے فائدہ اٹھایا۔ اس دوران تمام مردے گاریز کے گرد گھیرا ڈال چکے تھے۔ والٹ تیزی سے قربان گاہ کے چبوترے کی طرف آیا اور جلدی سے گلوریا کو

رہا کرا لیا۔ پھر اس نے روتی، بلکتی اور سسکتی گلوریا کو سہارا دے کر قربان گاہ کے چبوترے سے اتارا اور اس کی کمر میں بازو ڈال کر اسے سہارا دے کر چل پڑا۔

غار میں آگ کے شعلے تیزی سے پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ گاریز نے خود کو مردوں کے جھرمٹ سے نکالا اور والٹ اور گلوریا کے تعاقب میں بھاگا۔ اس نے راستے میں پڑی ہوئی ایک دہکتی ہوئی لکڑی اٹھائی اور حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ والٹ گلوریا کے سامنے ڈھال بن کر کھڑا ہو گیا۔ گاریز ایک لمحے کے لئے رکا پھر آگے بڑھنے لگا۔ گلوریا دل ہی دل میں والٹ کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

یکایک لفٹ رکنے کی آواز آئی اور کاؤنٹ کارلائل ایک فرشتے کی طرح نمودار ہوئے۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر گلوریا کو اپنی جانب کھینچا اور اسے لفٹ میں دھکیل دیا۔ پھر وہ گاریز کی طرف متوجہ ہوئے اور ابھی آگے بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ دو تین مردوں نے پیچھے سے آ کر گاریز پر حملہ کر دیا۔

گاریز نے خود کو ان کی گرفت سے آزاد کرانے کی جدوجہد شروع کر دی اور اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے کاؤنٹ کارلائل نے بجلی کی سی سرعت سے آگے بڑھ کر والٹ کو اپنی طرف گھسیٹ لیا اور اسے لے کر لفٹ میں داخل ہو گئے۔ پورا غار اس وقت جلتے ہوئے جسموں کا ایک انبار نظر آتا تھا۔ ان کے کانوں نے گاریز کی آواز کو غار میں گونجتے ہوئے سنا۔

گاریز نے ایک روح فرسا چیخ ماری۔ غالباً" اب مردوں نے اسے مکمل طور پر اپنے گھیرے میں لے لیا تھا اور وہ ان کی گرفت سے ہرگز نہیں نکل سکتا تھا۔ لفٹ تیزی سے اوپر اٹھنے لگی۔ گلوریا والٹ کے کندھے سے سر ٹکائے سسک اور بری طرح کانپ رہی تھی۔

کاؤنٹ کارلائل نے گلوریا کے شانے تھپتھپائے اور محبت سے ان دونوں کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کے لبوں پر ایک مطمئن اور شفیق مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

پھر گلوریا کی کمزور آواز ابھری۔ "ڈیڈی۔ میں اب تک یہ نہیں سمجھ سکی کہ آخر ان مردوں کو آگ کیسے لگ گئی۔ آخر یہ سب کیا معمہ تھا؟"

کاؤنٹ کارلائل دھیرے سے مسکرائے اور بولے۔ "میری بچی۔ یہ تو بالکل سیدھی سی بات ہے۔ جب اوپر کمرے میں آگ بھڑکی تو اس آگ نے اس بیگ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا جس میں میں نے تمام پتلے اور چھوٹے چھوٹے تابوت جمع کئے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب ان پتلوں کو آگ لگی تو مردوں کے جسم بھی آگ کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے اور یہ طلسماتی سلسلہ ختم ہو گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ گاریز بھی اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔"

باہر آ کر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ تمام آسمان پر دور دور تک سرخی پھیلی ہوئی تھی اور اب ایک نئی روشن اور خوبصورت صبح اس گاؤں پر طلوع ہونے کو تھی۔ کاؤنٹ کارلائل بولے۔

"آخر کار مردوں کو دائمی موت نصیب ہو گئی۔ اب یہ زندہ لاشیں --- یہ بے چین روحیں قیامت تک سکون سے رہ سکیں گی اور گاریز کو بھی اپنے کئے کی سزا مل ہی گئی۔"

وہ تینوں تھکے تھکے قدموں سے گاؤں کی طرف چل دیئے۔

☆☆☆

خالی کفن

وہ بڑی بوڑھیاں بھی جو پہلے نیلم اور اس کے گھر والوں کا مذاق اڑایا کرتی تھیں' اب بڑے دعوے سے قسمیں کھا کر یہ تصدیق کرنے لگی تھیں کہ واقعی نیلم پر جن عاشق ہے۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ ان آزمائشوں کو پیش کرتیں جن پر انہوں نے نیلم کو پرکھا تھا۔ مثلاً" کوئی کہتی میں نے اس موسم میں جب دور دور کہیں جامن دیکھنے میں نہیں آتے نیلم سے کہا کہ اگر وہ ابھی اسی وقت کھلے کھلے سیاہ جامن منگا دے تو میں جن کا عاشق ہونا تسلیم کر لوں گی اور اسی وقت نیلم نے اٹھ کر انگیٹھی پر سے پیالہ اٹھایا تو اس میں پاؤ بھر بڑے مزیدار نمک لگے موٹے موٹے جامن تھے۔ کوئی قسم کھا کر کہتی کہ ایک دن اس کی فرمائش پر وہیں بیٹھے بیٹھے نیلم نے ایسی مزیدار اور عجیب سی مٹھائی کھلائی جو پرستان ہی کی ہو سکتی تھی کیونکہ آج تک نہ ایسی مٹھائی دیکھی اور نہ ایسی لذت سے زبان آشنا ہوئی تھی۔

نیلم کے والد عبدالمتین میونسپلٹی میں ملازم تھے۔ مگر نیلم پر جن کے عاشق ہونے والی بات نے انہیں پورے علاقے کی معروف شخصیت بنا دیا تھا۔ اس کے باوجود جب کہیں سے نیلم کے رشتے کا کوئی پیغام نہ آیا تو وہ فکر مند رہنے لگے۔ انہیں یہ شہرت بدنامی معلوم ہونے لگی اور جوں جوں نیلم کی عمر زیادہ ہوتی گئی وہ اپنی ہی پھیلائی ہوئی بات کی تردید بڑے شدومد سے کرنے لگے۔ بیٹی چاہے فقیر کی ہو خواہ بادشاہ کی' پرایا دھن ہوتی ہے اور اس کا ہاتھ کسی نہ کسی کے ہاتھ میں دینا ہی پڑتا ہے۔ بیٹی سب کی بیاہی جاتی ہے۔ یہ گھر بٹھائے رکھنے کی چیز نہیں ہوتی۔ پھر جو بیٹی اتنی خوبصورت ہو کہ ہاتھ لگائے رنگ میلا ہو اس کے رشتے تو گھر بیٹھے آتے ہیں۔ صاف ظاہر تھا کہ نیلم کے رشتے کی بات کرتے ہوئے لوگ ڈرتے تھے اور یہی ڈر اب نیلم کے والد پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ وہ اکثر نیلم کی ماں سے سوال کرتے کہ نیلم کا کیا بنے گا؟ نیلم کے مستقبل کے بارے میں سوچ سوچ کر نگینہ خانم بھی حد

درجہ پریشان ہو جاتی۔ وہ انتہائی پچھتاوے کے ساتھ یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ دو چار سال میں نیلم کی جوانی ڈھل جائے گی۔ پھر تو اچھے رشتے ملنے کی امید بالکل ختم ہو جائے گی۔ کیا میری چاند سی بچی یونہی ڈال پر لگے پھول کی طرح مرجھا کر رہ جائے گی۔ جب وہ اس زاویے سے سوچتی تو اسے اپنے متعلق یہ فیصلہ کرنا پڑتا کہ بیٹی کے حق میں اس نے ڈائن کا کردار ادا کیا ہے۔ اس نے نیلم پر جن عاشق ہونے کا ڈھنڈورا پیٹ کر اس کی زندگی تباہ کر دی ہے۔

حقیقت بھی یہی تھی کہ شروع شروع میں خود نگینہ خانم نے مزے لے لے کر اس بات کا چرچا کیا تھا۔ حالانکہ اس نے کبھی جن کی جھلک تک نہ دیکھی تھی مگر حلفیہ بیان کرتی کہ ٹھیک رات کے بارہ بجے دروازہ بڑے زور سے کھلتا ہے سب گھر والے جاگ جاتے ہیں مگر کسی میں اتنا دم نہیں ہوتا کہ بستر سے اٹھ سکے۔ اپنی اپنی جگہ دم سادھے پڑے رہتے ہیں۔ نیلم کسی سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ کبھی کھانوں' کبھی مٹھائیوں اور کبھی پھلوں کی خوشبوؤں سے کمرہ مہک اٹھتا ہے۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد دروازہ خود بخود بند ہو جاتا ہے۔ محلے کی عورتیں اچنبھے' دلچسپی اور بے یقینی کے عالم میں محیرالعقول باتیں سنتی رہتیں اور پھر جب دوسری عورتوں سے ملتیں تو انہی انوکھے اور حیرت انگیز واقعات کو مزید رنگ آمیزی کے ساتھ اپنے چشم دید کہہ کر سناتیں۔

نیلم محلے کی تمام کنواری لڑکیوں میں سب سے بڑی عمر کی تھی۔ اس کے سامنے چودہ چودہ پندرہ پندرہ سال کی لڑکیاں ڈولے میں بیٹھ کر سسرال رخصت ہو چکی تھیں۔ جو ابھی بیٹھی تھیں ان میں زیادہ سے زیادہ سولہ سال کی ہوں گی۔ ان کی بھی منگنیاں ہو چکی تھیں یا کم از کم بات کہیں طے پا چکی تھی۔ صرف وہ تھی جو بیس برس کی ہونے کے باوجود ماں کے کولہے سے لگی بیٹھی تھی۔ حسن کی وہ دمک جو اس کے وجود سے پھوٹی پڑا کرتی تھی سردیوں کی دھوپ کی مانند دھندلی پڑنے لگی تھی۔ تاہم اس کے چہرے پر کبھی کسی پریشانی کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ وہ ہر وقت مسکراتی رہتی جیسے کوئی اندر ہی اندر اسے گدگدا رہا ہو۔ ہر جمعرات کو صبح ہی نہا دھو کر نیا جوڑا پہنتی' خوشبو لگاتی اور پھر کتنی دیر تک کمرے میں بند رہتی۔ جب پہلی

مرتبہ نیلم نے یہ عمل کیا تھا اور ساری دوپہر وہ کمرے سے باہر نہ نکلی تھی تو اس کی ماں فکرمند ہو گئی۔ وہ گلا پھاڑے نیلم کو پکارتی رہی۔ دروازہ پیٹ پیٹ کر اپنی ہتھیلیاں سرخ کر لی تھیں۔ پھر بھی نیلم نے ہنکارا بھرا نہ دروازہ کھولا تو اس نے خوفزدہ ہو کر محلے والیوں کو جمع کر لیا۔ سب عورتیں فکرمند ہو کر عجیب عجیب قیاس آرائیاں کرتے ہوئے بار بار دروازے کی طرف دیکھتی رہی تھیں۔ کبھی انہیں یہ ڈر لگنے لگتا کہ ابھی جن باہر نکلے گا اور سب کو کھا جائے گا۔ کبھی ان پر یہ خوف غالب آ جاتا کہ دروازہ توڑ کر جب اندر پہنچیں گے تو نیلم مری ہوئی ملے گی۔ مگر جب دروازہ کھلا تو نہ جن نمودار ہوا اور نہ نیلم مری ہوئی ملی بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوش باش اور تروتازہ کمرے سے باہر آئی تھی۔

اس کے بعد کئی مرتبہ نیلم نے یہی خاص عمل کیا۔ اس کی ماں نے ایک دو بار جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی کہ نیلم کمرے میں بند ہو کر کیا کرتی ہے مگر ہر بار وہ ایسی گری جیسے کسی نے بڑے زور سے اسے دھکا دے دیا ہو۔ پھر تو اس پر ایسا خوف طاری ہوا کہ ایسے موقع پر وہ بند دروازے کی طرف دیکھنے تک کی ہمت نہ کر سکی۔ نیلم کی سہیلیاں بھی نیلم سے ڈرتی تھیں۔ ڈر کے ساتھ ساتھ انہیں رشک بھی ہوتا تھا۔ کبھی کوئی سہیلی جن کے بارے میں پوچھ بیٹھتی تو وہ بڑے چٹخارے لے کر پرستان کی باتیں سناتی۔

سردیوں کا موسم تھا کمرے میں کوئلوں سے بھری انگیٹھی دہک رہی تھی۔ ایک چارپائی پر نیلم کے والد' والدہ' خالو اور خالہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اس کے مقابل والی چارپائی پر نیلم اپنی خالہ زاد بہن اور دو تین سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی بجھارتیں بوجھ رہی تھی۔ اچانک نیلم کی چادر سر سے پھسل کر انگیٹھی میں جا پڑی۔ شکیلہ چلائی۔ "ارے نیلم کی چادر جل گئی۔" خالو نے پلٹ کر انگیٹھی میں سے چادر اٹھائی تو سرخ کوئلے اسی طرح دہک رہے تھے اور چادر جلنا تو درکنار گرم بھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر سب حیرت زدہ ہو گئے اور پھر ساری رات نیلم کے بچپن سے جوانی تک رونما ہونے والے واقعات دہرائے جاتے رہے۔

نیلم کے خالو نے تمام واقعات کو سچ ماننے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ

بس فرضی قصے ہیں۔ جنوں بھوتوں کے اول تو وہ قائل ہی نہیں اور بالفرض محال جنات کا ہونا تسلیم کر بھی لیا جائے تو وہ یہ ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں کہ کوئی جن نیلم پر عاشق ہے۔ یہ ذہنی بیماری ہو سکتی ہے اور آپ سب لوگ وہم میں مبتلا ہیں۔ نگینہ خانم کو اپنے بہنوئی کی اس بات پر تاؤ آگیا اور وہ بولی۔ "بھیا مثل مشہور ہے جس تن لاگے وہ ہی جانے اور نہ جانے کوئی تمہیں کیا پتہ ہم کس مصیبت میں گرفتار ہیں۔ علاج معالجہ میں کسر نہیں چھوڑی۔ تعویذ گنڈے بھی کرا کے دیکھ لئے۔ دیوبند لے جا کر جھاڑ پھونک بھی بہت کرا چکے مگر نہ نیلم کو جن کی بیماری سے نجات ملی نہ ہمارا وہم دور ہوا۔ تم ہی اس کا علاج کرا دو۔ آخر تمہاری بھی تو کچھ لگتی ہے۔"

خالو نے مسکرا کر کہا۔ "اس کا علاج بہت آسان ہے۔ نیلم کی شادی کر دو۔ جن چلا جائے گا اور یہ ٹھیک ہو جائے گی۔"

رشید کی بات سن کر دونوں میاں بیوی نے ٹھنڈی سانس بھری اور اداس ہو گئے کیونکہ یہی تو وہ مسئلہ تھا جو حل ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ آخر بڑی سنجیدگی سے اس بارے میں بات چیت ہونے لگی اور رشید نے چٹکیوں میں یہ مسئلہ یوں حل کر دیا کہ نیلم کا رشتہ اس کے لڑکے نذیر سے کر دیا جائے۔ اگرچہ نذیر کسی لحاظ سے بھی نیلم کا جوڑ نہیں تھا۔ اس کے عادات و اطوار اچھے نہیں تھے۔ کبوتر بازی کا شوق اور جوا کھیلنے کی لت تھی۔ اکڑباز اور گستاخ پرلے درجے کا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی شادی ابھی تک نہیں ہو سکی تھی اور نگینہ خانم اپنے بھانجے کی بجائے کسی اچھے رشتے کی متوقع رہی تھی۔ جب کہیں سے رشتہ آنے کی آس نہ رہی تو یہی غنیمت سمجھا کہ گھر کی بلا گھر ہی میں کھپ جائے تو اچھا ہے۔ شادی کے بعد کوئی اونچ نیچ ہو بھی گئی تو کم از کم رسوائی سے بچے رہیں گے۔ یہی کچھ سوچ کر نگینہ خانم اور عبدالمتین نے پیش کش قبول کر لی اور چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق دن بھی مقرر ہو گیا۔

کفیل بھی نچنت ہو گئے اور نیلم کے والدین کی الجھن بھی دور ہو گئی مگر دن مقرر کئے جانے کے بعد جو رات آئی وہ کفیل پر بہت کڑی گزری۔ وہ ساری رات تھوڑے تھوڑے وقفے سے چیختے چلاتے رہے۔ یوں ہوتا رہا کہ جیسے ہی ان کی آنکھ

لگتی کوئی ان کی چھاتی پر سوار ہو کر گلا گھونٹنے لگتا اور وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھتے۔ صبح ہوئی تو ان کا رنگ زرد اور آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ کھانا کھانے بیٹھے تو اچانک ان کے سامنے سے سالن اور روٹیاں غائب ہو گئیں۔ چائے پینے لگے تو گرم گرم چائے کا پیالہ منہ پر ایسے انڈیلا گیا کہ سارا چہرہ سرخ ہو گیا۔

کسی بات کی آس لگ کر ٹوٹ جائے تو زیادہ دکھ ہوتا ہے۔ نیلم کی ماں اور باپ کو بھی اب پہلے سے کہیں زیادہ فکر ہو گئی تھی۔ ان کا خدشہ ٹھیک ہی نکلا کفیل نے کھتولی جاتے ہی لکھ دیا کہ "نیلم کا رشتہ نذیر سے تو نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ بہت آوارہ ہے اور وہ نیلم کی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتے۔ ویسے بھی اندیشہ ہے کہ اس رشتے کے بعد ان کے تعلقات خراب نہ ہو جائیں۔ البتہ ایک بہت اچھا رشتہ مل گیا ہے۔ بھائی عبدالمتین آ کر لڑکا دیکھ جائیں۔ لڑکے کا باپ دیوبند کا پڑھا ہوا مولوی ہے۔ لڑکا گرداور ہے۔ بہت اچھا تعلیم یافتہ گھرانہ ہے۔"

اس خط نے عبدالمتین کی ٹوٹتی امیدوں کو ایک نیا سہارا فراہم کیا اور وہ کھتولی پہنچ گئے۔ لڑکا دیکھا' صورت شکل کا خوبرو صحتمند نوجوان تھا۔ رسمی بات چیت کے بعد مولوی صاحب کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ وہ لوگ آئے تو نیلم کو دیکھ کر ریجھ گئے۔ نیلم دبی زبان سے اس شادی کے خلاف احتجاج کرتی رہی۔ اپنی سہیلیوں کی وساطت سے یہ تک کہلوایا کہ اگر انہوں نے اس کی شادی کی تو اس سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ مگر کسی نے اس کی دھمکیوں پر توجہ نہ دی۔

ایجاب و قبول کے موقعہ پر بڑی بوڑھیوں اور نیلم کی سہیلیوں نے ہرچند زور مارا کہ وہ "ہاں" کہہ دے مگر نیلم ٹس سے مس نہ ہوئی۔ پھر نہ جانے کس لڑکی نے نیلم کی بغل میں منہ گھسا کر ہولے سے "ہوں" کر دی اور اردگرد جمع عورتیں بیک زبان پکاریں "ہاں ہو گئی۔" مختصر سی رسومات کے بعد نیلم کو ڈولے میں بٹھا کر سسرال رخصت کر دیا گیا اور عبدالمتین نے سکھ کا سانس لیا۔ اگرچہ دل میں اب بھی بہت سے وسوسے اور دھڑکے سمائے ہوئے تھے مگر وقتی طور پر ہی سہی وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے تھے۔

ان کا یہ سکون اور اطمینان دیرپا ثابت نہ ہوا بلکہ ایک زبردست طوفان بن کر

ان کی خوشیوں اور مسرتوں کو ہمیشہ کے لئے ملیامیٹ کر گیا۔ دوسرے دن وہ چند رشتہ داروں کے ہمراہ بیٹی کو لینے کھتولی پہنچے تو بیٹی کی بجائے اس کی لاش سے گلے ملنا پڑا۔ شادی کا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ اس جوان اور اچانک بلکہ حیرت انگیز موت کی خبر سنتے ہی قرب و جوار کے لوگ مولوی صاحب کے گھر جمع ہو گئے تھے۔ عورتیں اس پری پیکر حسینہ اور سیم تن نیلم کے دیدار کرنے کے لئے ایک دوسری پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں جس کے متعلق یہ چرچا سنا تھا کہ اس پر جن عاشق تھا۔ مختلف قسم کی چہ میگوئیاں اور قیاس آرائیاں کی جا رہی تھیں۔ ہر ایک کی زبان پر یہی ذکر تھا کہ جن نے نیلم کی جان لے لی۔

مولوی صاحب نے عبدالمتین کو تسلی دیتے ہوئے سارا ماجرا سنایا۔ واقعات کے مطابق جیسے ہی نیلم دلہن بنی ان کے گھر میں اتری' بار بار بتیاں بجھ جاتی رہیں۔ چراغ اور دیئے تو خیر ہوا کے جھونکوں سے بجھ سکتے تھے مگر حیرت یہ تھی کہ لالٹین بھی گل ہو جاتی تھی۔ گھر والے اس خلاف معمول اندھیرے سے ڈر گئے پھر بھی جب دولہا نے دلہن کے کمرے میں قدم رکھا تو دلہن نے دولہا کو ڈانٹ دیا کہ خبردار مجھے ہاتھ نہ لگانا ورنہ تمہاری جان کی خیر نہیں ہو گی۔ دولہا نے حیران ہو کر اس دھمکی کی وجہ پوچھی تو دلہن نے بتایا کہ اس پر جن عاشق ہے اور جو بھی ادم زاد اس پر دست درازی کرے گا' جن اسے جان سے مار ڈالے گا۔ دولہا نے اس کی ان باتوں کو مکر اور تریاچلتر پر محمول کرتے ہوئے شوہرانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی تو اسے اپنی دلہن پہلی بار شیرنی کے روپ میں نظر آئی' دوبارہ چڑیل دکھائی دی اور تیسری بار ناگن بن کر اسے لپٹ گئی۔ وہ دہشت زدہ ہو گیا اور چیخ مار کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

مولوی صاحب بیٹے کی زبانی یہ روئداد سن کر خود دلہن کے کمرے میں گئے اور طنزاً" کہا۔ "دلہن۔ ہم نے پہلے ہی سن رکھا ہے کہ تم پر جن عاشق ہے لیکن ہمیں قائل کرنے کے لئے تمہیں ثبوت دینا ہو گا۔ سنا تم نے۔ اس شادی پر میں نے تیس ہزار روپے لے کر خرچ کئے ہیں۔ اپنے جن سے ہمیں یہ روپے منگوا دو۔ ہم مان جائیں گے کہ تم سچی ہو۔ ورنہ یاد رکھو تم نے سب کو الو بنا لیا مگر یہاں تمہارے چلتر

نہیں چلیں گے۔ میں جن اتارنا جانتا ہوں۔ سمجھیں۔"

ساری رات گھر میں یہی باتیں ہوتی رہیں کہ دلہن بہت چالاک ہے۔ اس کی کسی سے آشنائی ہے۔ شادی سے بچنے کے لئے جن کا ڈھونگ رچا رکھا ہے مگر صبح اٹھے تو مولوی صاحب یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ ان کے سرہانے ایک مخملی تھیلی رکھی تھی جس میں پورے تیس ہزار روپے تھے۔ جیسے ہی گھر والوں کو اس رقم کا علم ہوا سب کو یقین ہو گیا کہ واقعی نیلم پر جن عاشق ہے۔ کسی کو نیلم کے کمرے میں جانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ کافی دن چڑھے مولوی صاحب ڈرتے ڈرتے کمرے میں گئے تو یہ دیکھ کر ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کہ نیلم دلہن بنی سیج پر مردہ پڑی تھی۔ بس پھر کیا تھا۔ ذرا سی دیر میں کھلبلی مچ گئی اور یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے قصبے میں پھیل گئی۔

کچھ دیر میں نگینہ خانم اور دیگر رشتہ دار بھی پہنچ گئے تو رو دھو کر نیلم کی میت تیار کی گئی۔ جنازہ اٹھا تو ہر آنکھ اشکبار تھی۔ نیلم کی ماں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اور نیلم کی سسرال والوں کو کوس رہی تھی کہ انہوں نے میری بچی کو مار ڈالا۔ جنازے کے ساتھ اتنی بھیڑ تھی کہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت کے جنازے میں بھی اتنے لوگ آج تک شریک نہیں ہوئے تھے۔ جنازہ قبرستان پہنچا تو قبر تیار تھی۔ چار آدمیوں نے پردہ تانا اور گورکن نے کہا۔

"ذرا سنبھل کر اور کھینچ کر میت اٹھانا۔"

ایک نے سرہانے سے کفن پکڑا اور دوسرے نے پائنتی کی طرف سے اور کلمہ شہادت کہتے ہوئے میت کو اٹھانا چاہا تو کفن اوپر اٹھ آیا۔ دونوں آدمیوں کی چیخ نکل گئی اور کفن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔۔۔ کیونکہ وہ خالی تھا۔

☆☆☆☆

پریوں کا ٹولہ

میرا مزاج لڑکپن سے مزاحیہ تھا۔ دوسرے ملازموں سے ہنسی مذاق میں خاص لطف حاصل ہوتا۔ اس زمانے میں ریڈیو' سنیما وغیرہ کا چلن نہیں تھا۔ کہیں کہیں تھیٹر ہوا کرتے تھے۔ میں نے دل کے بہلانے کو ایک بینجو خرید لیا۔ دو سال کی پریکٹس سے میں پورا ٹرینڈ ہوگیا۔ کلائی پر گھنگرو باندھ کر بجایا کرتا۔ محلے والے اس شوق فضول سے باز رہنے کی تلقین کرتے کہ ان کی مستورات کے خیالات پر برا اثر پڑتا ہے لیکن اس شوق فضول نے میری قدریں بدل دیں۔ بہرحال میں جہاں بھی جاتا بینجو ساتھ ہوتا جس طرح شکار کا رسیا بندوق اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ انہی ایام میں کالا باغ جانے کا اتفاق ہوا۔

گرمی کا موسم تھا اور اندھیری کالی رات۔ حسب عادت میں نے ساز چھیڑ دیا۔ میرے میزبان نے اعتراض کیا کہ یہ وقت ساز بجانے کا نہیں ہے۔ محلے والے برا محسوس کریں گے۔ میں نے کہا اچھا بھئی میں باہر چلا جاتا ہوں اور مہمان خانہ سے نکل گیا۔ چرس پینے کا سودا بھی سر میں رکھتا تھا۔ چرس بھی ساتھ لے گیا اور قبرستان کی راہ لی جو میزبان کے گھر سے کوئی میل بھر دور تھا۔ وہاں جا کر آگ سلگائی اور چرس کے خوب کش لگائے۔ جب موڈ میں آگیا تو ایک قبر کے ساتھ ٹیک لگا کر ساز چھیڑ دیا۔ گھنگرو بھی باندھ لئے تھے۔ قبرستان میں سناٹا طاری تھا۔ جوانی کی راتیں' امنگوں کے دن تھے۔ مستی چھا گئی۔ معاً تین پریاں نازل ہوئیں اور کہا "شاباش۔ ڈرو نہیں' ہم تمہارے ساز سے متاثر ہیں۔ ساز بجاتے رہو ہم تمہیں خوش کریں گی۔"

چنانچہ میں ساز بجاتا رہا۔ وہ مستانہ وار ناچتی رہیں۔ میں بھی لے کے مطابق ساز بجا رہا تھا۔ آخر انہوں نے رقص ختم کیا۔ وقت رخصت دوسری رات کا وعدہ بھی لے لیا اور دوبارہ کہا کہ ہم تمہیں خوش کریں گی۔ میں خود ان پری زادوں کے

حسن عالم تاب سے اثر لے چکا تھا۔ دوسری رات حاضری دی اور حالت مستی میں انہیں چھو کر دیکھا لیکن مادی وجود نہیں تھا۔ انہوں نے صراحت کی کہ ہم شہیدوں کی ارواح ہیں۔ پھر تو رات دن عالم تصور میں پری زاد رقص کرتی دکھائی دیتے۔ ڈیوٹی بھی دے رہا ہوں لیکن دماغ پری زادوں سے متعلق سوچوں میں الجھا ہوا ہے۔ ان کے حسین ملبوسات مختلف رنگوں کے تھے۔ میں انگریز کا غلام تھا' آفیسر سے التجا کی کہ میرا تبادلہ کالا باغ کر دیں۔ انہوں نے عیسیٰ خیل ٹرانسفر کر دی۔ میں نے عیسیٰ خیل کو بھی غنیمت سمجھا اور موقع پا کر قبرستان میں چلا گیا۔ آج کل وہاں مالٹے کے باغ ہیں۔ وقت ملاقات پری زادوں سے درخواست کی کہ مجھے معدنیات حاصل کرنے کا شوق ہے۔ میری رہنمائی کریں۔ انہوں نے مجھے کھنڈرات کا پتا دیا۔ غربی جانب دریائے سندھ کے ساحل پر کھنڈرات ہیں۔ ان کی ہدایت پر میں وہاں گیا۔ ایک مقام پر زمین میں دبے ہوئے برتن کا کنارہ پاؤں کی ٹھوکر سے ظاہر ہوگیا۔ جائزہ لیا تو سونے کے زیورات نکلے۔ پچاس دانہ یاقوت' پچاس دانہ نیلم' جن کا دھاگہ بوسیدہ ہوگیا تھا۔ ان دنوں سونا ۲۵ روپے تولہ تھا۔ پانچ سو کا سونا فروخت کیا۔ دانہ نیلم ایک انگریز کو دیئے۔ انہوں نے خوشنودی کا اظہار کیا اور کافی انعام دیا۔ پری زادوں نے مجھے ایک وظیفہ بھی بتا دیا۔ نماز فجر کے بعد مصلے کے نیچے سے پانچ روپے برآمد ہوتے۔ اگرچہ کچھ دن بعد وظیفہ بند ہوگیا جس کی توجیہہ آئندہ سطور میں آ رہی ہے۔

وہ پریاں سگی بہنیں تھیں۔ کاشفہ' واہبہ اور عائلہ۔ حفظ عصمت میں مقابلہ کرتے ہوئے تینوں کی تینوں شہید ہوگئیں۔ اٹھارہ' بیس اور بائیس سال کی عمر تھی۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ شہید ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ میں نے عرض کی کہ میں غریب ملازم ہوں کل سترہ روپے مشاہرہ ملتا ہے۔ جبھی انہوں نے وظیفہ بتایا تھا۔ ان دنوں مجھے ساز کے ساتھ ساتھ شکار سے دلچسپی تھی۔ ایک رات بندوق اٹھائے شکار کی تلاش میں سرگرم تھا۔ گرمی کا موسم تھا' گھنا جنگل' راہ راست چھوڑ کر شارٹ کٹ سے جا رہا تھا۔ راستہ کچا تھا۔ ناگاہ کسی نے پیچھے سے میرے لمبے لمبے بال پکڑ لئے۔ دھچکے سے میری بندوق نیچے گر گئی۔ میں اس ناگہانی افتاد کے لئے تیار نہیں تھا۔ بعد

میں معلوم ہوا کہ وہ ڈائن تھی۔ لمبے لمبے بال' بہت بڑا قد' چوڑا سینہ' پستان منگیزدں کی مانند۔ رات کے وقت چھٹکی ہوئی چاندنی میں اس کی آنکھیں انگاروں کی مانند چمک رہی تھیں۔ میں نے بھی غیر شعوری طور پر اس کے بال پکڑ لئے۔ اس زمانے میں میں بھی کڑیل جوان تھا۔ اس کا سر بہت بڑا تھا۔ آج تک اس کی دہشت یاد ہے۔ ہماری زور آزمائی سے زمین میں گڑھے پڑ گئے' جیسے درندے لڑ رہے ہوں۔ نہ وہ مجھے گرا سکی نہ میں اسے گرا سکا۔ وہ اپنے ناخن خنجر کی مانند میرے جسم پر آزما رہی تھی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں بری طرح گھبرا گیا تھا۔ کپڑے تار تار ہو چکے تھے اور میں ننگا ہو گیا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ کمزور فریق دانتوں کا سہارا لیتا ہے۔ لہٰذا سر کے بال پکڑے پکڑے میں نے دانتوں سے اس کی ناک پکڑ لی اور کچکچا کر اس وقت چھوڑی جب اس کا معتول حصے میرے منہ میں رہ گیا۔ میرا اپنا خون اور اس ڈائن کا خون دونوں مل کر لالہ زار کا منظر پیش کر رہے تھے۔ ناک کٹواتے وقت اس بلا نے ایسی دہشت ناک چیخ ماری کہ زمین و آسمان لرز گئے۔ شکست کھا کر وہ مغرب کی طرف بھاگی اور اسی سمت سے آواز آئی۔ "سنبھل کر رہنا"۔ میں نے فوراً" بندوق اٹھائی مگر وائے حسرتا کہ اتنی دیر میں وہ چھلاوے کی طرح نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ مجبوراً" واپس آ گیا۔

صبح سویرے سرکاری ہسپتال پہنچا۔ ہندو ڈاکٹر تھا۔ میں نے حال سنایا اور کہا کہ رات نہایت بے چینی سے گزری ہے۔ ڈاکٹر کہنے لگا اس جنگل میں بڑی بڑی بلائیں آباد ہیں۔ بعض عورتیں وحشی ہو جاتی ہیں اور جنگل کی باسی بن کر انسانی گوشت پر گزارہ کرتی ہیں۔ بہرحال ڈاکٹر کی خصوصی توجہ سے زخم مندمل ہو گئے تو نویں دن میں نے پھر بندوق اٹھائی اور شکار کو چل دیا۔ پہلے کالا باغ جا کر پری زادوں سے ملاقات کی اور جنگلی عورت کی روئیداد سنائی۔ وہ بولیں۔ "وہ ڈائن تھی۔ اسے ہم نے سزا دے دی ہے اور اسے دریائے سندھ میں ڈبو دیا ہے۔ اب وہ نہیں آ سکتی۔"

گرمی کا موسم تھا' میں پری زادوں سے جدا ہو کر جنگل میں جا نکلا۔ وہاں ایک گھنا درخت نظر آیا۔ جی چاہا کہ اس کے سائے میں آرام کروں لیکن قریب پہنچا تو

عجیب دہشت انگیز منظر دکھائی دیا۔ یہ چیڑ کا سینکڑوں سال پرانا درخت تھا اور اس کے اوپر ایک اژدھا استراحت فرما رہا تھا۔ اس کا سر کہیں اور دم کہیں پڑی تھی۔ درخت پچیس فٹ سے زیادہ بلند تھا اور تنا کم و بیش سات فٹ قطر کا تھا اور اس نے کم از کم پچیس مرلے جگہ گھیر رکھی تھی۔ اژدھے کے کان خاکی رنگ کے گھوڑے کے کانوں جیسے تھے۔ دم اس قدر طویل کہ کئی شاخوں پر لدی ہوئی تھی اور وہ خراٹے لے رہا تھا۔ میں نے سوچا قتل موذی کا ایسا اچھا موقع کب ملے گا۔ کان کی جڑ میں گولی ماری جس کے رد عمل میں قیامت برپا ہو گئی جیسے انجن سے سٹیم خارج ہوتے وقت آواز نکلتی ہے۔ دم کی پھنکار سے درخت کی ٹہنیاں ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے آ رہی تھیں۔ اژدھا موت کی تکلیف سے اونٹ کی مانند بلبلا رہا تھا۔ کوئی گھنٹہ بھر وہ کشاکش موت و حیات میں مبتلا رہا۔ کئی مردہ خرگوش اور چکور اس کے سانس کے ساتھ اس کے پیٹ سے برآمد ہوئے۔ وہ دس من سے زیادہ وزنی تھا۔ اس زمانے میں مجھے معلوم نہیں تھا کہ گورنمنٹ مار کشی پر انعام بھی دیتی ہے۔ جب پتہ چلا تو اس کی ہڈیاں بھی فنا ہو چکی تھیں ورنہ خاصا انعام حاصل ہوتا۔ اسے موت کے گھاٹ اتار کر میں عیسیٰ خیل آ گیا۔ چند روز بعد چھٹی لے کر میں پھر اسی جنگل میں پہنچ گیا۔

ایک مقام پر کچھ اس قسم کی آواز سنائی دی جیسے انجن وسل دے رہا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ کسی اژدھے کی آمد آمد ہے۔ میرے سنبھلنے تک اژدھے نے مجھے دیکھ لیا۔ دہشت سے میں پیچھے کی جانب دوڑا اور ایک جھاڑی کی آڑ لے کر نشیب میں اتر گیا۔ اسے مغالطہ ہوا کہ میں جھاڑی میں پناہ گزین ہوں۔ اس نے فوراً" جھاڑی کا محاصرہ کیا اور بل ڈال کر جھاڑی کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا۔ میں مڑ مڑ کر تماشا دیکھتا جا رہا تھا۔ کافی دور جا کر خرگوش وغیرہ کا شکار کیا۔ جب عیسیٰ خیل واپس آیا تو پری زادوں کی یاد نے ستایا۔ حسرت تھی کہ عیسیٰ خیل ہی میں ملاقات ہو جائے القصہ دو دن کے لئے کالا باغ چلا گیا۔ رات کو وقت ملاقات پری زادوں نے وضاحت کی کہ جھاڑی والے اژدھے کو ہم دیکھ رہے تھے۔ ہر وقت تمہارے ساتھ رہتے ہیں۔ میں نے التجا کی کہ میں ملازمت میں ہوں اور وقت نہیں ملتا کہ حاضر خدمت ہوں

لہٰذا گزارش ہے کہ وہیں آ جایا کریں۔ انہوں نے منظور کر لیا کہ مقامی قبرستان میں ملاقات ہو گی۔ میں نے پیسوں کی کمی کا اظہار کیا۔ اس باب میں بھی انہوں نے تشفی دی اور میں واپس چلا آیا۔

ایک رات مقامی قبرستان میں گیا۔ یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ رات کا وقت تھا۔ پری زاد آ گئے۔ میں نے عرض کی کہ کوئی کھنڈر وغیرہ بتائیں جس میں مال موجود ہو۔ انہوں نے بتایا کہ ریلوے سٹیشن سے دو میل جانب مشرق ایک پرانا کھنڈر ہے۔ اس میں سے کوئی نہ کوئی چیز ضرور برآمد ہو گی۔ چنانچہ میں دوسرے دن کھنڈر کی طرف جا نکلا۔ پہلے تو سرسری جائزہ لیا کہ کہیں کوئی سانپ وغیرہ نہ بیٹھا ہو۔ اطمینان کے لئے ٹارچ بھی اندر لے گیا۔ اندھیرے غار میں سینکڑوں چمگادڑ لٹکے ہوئے تھے جو میری آہٹ سن کر حرکت میں آ گئے۔ گویا طوفان آ گیا۔ میں بری طرح چمگادڑوں کے نرغے میں تھا۔ لائٹ بند کرتے ہوئے میں نے عالم تخیل میں پری زادوں کو یاد کیا۔ خدا کی شان تمام چمگادڑ اپنی اپنی پوزیشن میں واپس چلے گئے۔ کچھ دور آگے جا کر دوبارہ لائٹ جلائی تو دائیں جانب معمولی سا نشان دکھائی دیا۔ نشان گول تھا۔ میں نے کھرپے کی مدد سے اسے مزید چوڑا کیا۔ اس میں سے مٹی کا برتن برآمد ہوا۔ دل باغ باغ ہو گیا۔ گیس کی وجہ سے دم گھٹتا جا رہا تھا۔ لہٰذا تیزی سے باہر آ گیا۔ برتن کو چادر میں باندھا اور چل دیا۔ راستے میں اسے توڑا تو اس میں سے چاندی کے ٹیڑھے میڑھے سکے نکلے۔ یہ سکے میں نے چار آنے تولہ کے حساب سے ایک بنئے کے ہاتھ فروخت کر ڈالے۔ سکوں کے نیچے نیلم کے کچھ دانے بھی تھے جن میں سوراخ تھے۔ وہ میں نے ایک جوہری کے ہاتھ دو سو روپے میں فروخت کئے۔

انگریز آفیسر مجھ سے خوش تھے اور وقت اچھا گزر رہا تھا۔ پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ البتہ پری زادوں سے وارننگ تھی کہ زراندوزی سے پرہیز واجب ہے۔ کھاؤ' پیو اور بس۔ یہ دنیا عارضی چیز ہے۔ گزارے کے لئے سب کچھ ملتا رہے گا۔ غالباً" اسی خیال کی بنا پر وظیفہ بھی بند کر دیا تھا۔ پری زادوں کو میں گاہے گاہے رقص کراتا رہا۔ سانپ اور ڈائن کے بعد پھر کسی بلا سے میرا تصادم نہیں ہوا۔ میں

بھی جب تک پری زادوں کی جھلک نہ دیکھ لیتا' بے چینی سی محسوس کرتا۔

انہی دنوں مجھے مزید ٹریننگ کے لئے جبل پور جانا پڑا۔ آخری ملاقات پر ان سے عرض کیا کہ میں جبل پور کی طرف برائے ٹریننگ جانا چاہتا ہوں۔ اس بارے میں جو حکم ہو گا بسرو چشم قبول کروں گا۔ پری زاد بولے۔ "ضرور جاؤ ہم تمہارے ساتھ رہیں گے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔" میں نے بنوں سے ٹکٹ لیا اور عازم جبل پور ہو گیا۔ وہاں کے جنگلات دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ میں تو ان چیزوں کا رسیا تھا۔ ان جنگلوں میں زمانہ قدیم کے ہیبت ناک کھنڈر بھی موجود تھے۔ ایک پہاڑی پر مدن محل تھا۔ محل کی تمام عمارت سنگ سرخ سے بنائی گئی تھی۔ دوسری طرف دریائے نربدا موجزن تھا۔ بڑے بڑے تالاب نظارہ افروز تھے۔ سیر میں لطف آیا۔ ایک خاص تالاب کا نام بھی خاص و عام تالاب تھا۔ اس کے وسط میں مدن محل بنا ہوا تھا۔ سنگ سرخ کا عکس جمیل نظارہ فروزی میں مزید رنگ بھر رہا تھا۔ میں نے استاد سے درخواست کی کہ میں قدرے آزادی پسند پٹھان واقع ہوا ہوں۔ وہ بولا۔ "خان صاحب۔ آپ آزاد ہیں۔" اجازت پا کر میں جنگل میں چلا جاتا۔ مجھے اطمینان تھا کہ کمی زر کی صورت میں پری زاد غیبی امداد سے سرفراز کر دیتے تھے۔ آخری تالاب پر ایک مندر کی عمارت تھی۔ اس کا انچارج موہن نامی برہمن تھا۔ اس کے ساتھ میری دوستی ہو گئی۔ اس مندر میں ایک حسین و جمیل پری تمثال دوشیزہ پجارن بھی اقامت پذیر تھی۔ مجھے اس لڑکی سے محبت ہو گئی۔ وہ بھی مجھے چاہنے لگی۔ میں آزادانہ جنگلوں میں گھومتا پھرتا اور مندر میں بھی بیباکانہ آیا جایا کرتا۔ میرے ساز پر ہندو دل و جان سے فدا تھے۔ کیونکہ ان کے کلچر میں ساز کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ مجھے وہ عقیدت کی نظر سے دیکھتے اور گوروجی کہہ کر مخاطب کرتے۔ ان کا کوئی بچہ علیل ہوتا تو میں جھوٹ موٹ کچھ پڑھ کر پھونک دیتا۔ مولا کی شان کہ بچہ ٹھیک ہو جاتا۔

دوسرے سال اعلان پاکستان ہو گیا اور ساتھ ہی کشت و خون نے مثالی رنگ پکڑا۔ راستے مخدوش' رقص ابلیس عروج پر' ہر آن زندگی کے لالے۔ ٹریننگ سکول سے شفٹ ہو کر میں مستقل طور پر مندر میں آ گیا۔ میرے لئے ایک کمرہ مختص

کر دیا گیا۔ مندر کے باسی عقیدت سے پھولے نہ سماتے تھے۔ غرض یہاں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ان دنوں جبل پور شہر میں دو ماہ کے لئے ایک مشہور میلہ "مینا بازار" لگا ہوا تھا۔ جہاں دنیا بھر کی چیزیں دستیاب تھیں۔ طبیعت چونکہ مکدر تھی لہٰذا میلہ دیکھنے کو جی چاہا مگر خون خرابے کا اندیشہ شہر سے باہر نہیں نکلنے دیتا تھا۔ دل پر جبر کر کے تبدیلی لباس کے بعد میں میلے کی طرف چلا گیا۔ میری محبوبہ بولی۔ "گورو جی۔ کہاں چلے؟"

میں نے کہا۔ "ذرا مینا بازار تک۔"

وہ انگڑائی لے کر انداز خاص سے میری طرف دیکھ کر بولی۔ "مجھے بھی ساتھ لے چلیں۔"

میں نے کہا۔ "ہندو مسلم فساد زوروں پر ہے۔ ہندو ہماری یک جائی سے بیخ پا ہو جائیں گے۔"

وہ بولی۔ "آپ پہلی بس کے ذریعے اندھے دیوتا کے بازار کے سرے پر اتر جایئے میں دوسری بس کے ذریعے آن ملوں گی۔"

پروگرام کے مطابق میں پہلی بس کے ذریعے مجوزہ مقام پر پہنچ گیا۔ وہ بھی دوسری بس میں سوار ہو کر مجھ سے آن ملی۔ دونوں دیوانے بازار کی طرف چل دیئے۔ دس پیسے ٹکٹ تھا۔ میں نے دو ٹکٹ خریدے۔ اندر جا کر دیکھا تو انواع و اقسام کی اشیا فروخت ہو رہی تھیں۔ قارئین اندازہ کریں کہ لاکھوں ہندوؤں میں غالباً" میں ہی صرف ایک مسلمان موجود تھا۔ فرنٹیئر کا پٹھان' مونچھیں تنی ہوئیں' پہلوانوں کا سا ڈیل ڈول۔ بھلا کہاں چھپ سکتا تھا۔ میں نے لڑکی سے کہا۔ "مجھ سے پیسے لے لو۔ ساتھ ساتھ چلنے میں خطرہ ہے۔ گھنٹہ بھر بعد یہاں آ جانا۔ میں انتظار کروں گا۔"

وہ بے چاری ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہو گئی اور پھر مجھ سے جدا ہو گئی۔ رات کا وقت تھا لیکن روشنیوں کا طوفان برپا تھا۔ جب وہ واپس آئی تو ہم دونوں محو تکلم ہوئے۔ معاً" میری نگاہ ایک لٹھ باز رضاکار پر پڑی۔ وہ جن سنگھی تھا۔ جو چھپ کر ہماری باتیں سن رہا تھا۔ میں نے اسے متوجہ پا کر گالی دی۔ "سور کے بچے۔ یہاں کیا

کر رہے ہو؟"

اس نے غوغا بلند کیا کہ ہندو لڑکی کو پٹھان اغوا کر رہا ہے۔ پھر کیا پوچھتے ہیں۔ ہندوؤں کے جتھے کووں کی طرح کائیں کائیں کرتے ہوئے ہماری جانب آنے لگے۔ پہلا سوال پجارن لڑکی سے ہوا۔

"پٹھان کے ساتھ کیوں بیٹھی ہے؟"

"میں تو اسے جانتی ہی نہیں۔" پجارن نے جواب دیا۔ "میں تو جانتی بھی نہیں کہ یہ ہے کون؟ آپ لوگوں نے خواہ مخواہ شور مچا رکھا ہے۔"

ہندوؤں کو یقین نہ آیا۔ لڑکی کو الگ ہٹا کر میرا گھیراؤ کر لیا۔ میں سٹپٹایا۔ اتفاق سے کمانی دار چاقو میرے پاس موجود تھا۔ سپرنگ کھینچنے سے دہشتناک آواز نکلی۔ لالے گھبرا گئے اور پھر وہ بھگدڑ مچی کہ الامان۔ اسی بھگدڑ میں دکانداروں کی پیٹیاں الٹ گئیں۔

میں موقع سے فائدہ اٹھا کر گیٹ کی طرف بھاگا۔ کھلا ہوا چاقو دیکھ کر گیٹ کیپر مرعوب ہو گیا۔ میں بے تحاشا جنگل کی طرف بھاگ رہا تھا۔ کافی دیر کے بعد بس کے ذریعے واپس آ گیا۔ پجارن مجھے دیکھ کر بلائیں لینے لگی۔ اسے تو میں نے سارا قصہ فرار سنا دیا اور کسی کو نہیں بتایا۔ چند روز کے بعد مہاجر کیمپ قائم ہوا تو میں نے مندر والوں سے کہا کہ وہ مجھے اجازت دیں کہ میں کیمپ کے ذریعے پاکستان چلا جاؤں۔ میں آپ لوگوں کے حسن اخلاق کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ کیا کروں میرا وطن پاکستان ہے اور میرے ماں باپ' بہن بھائی چشم براہ ہوں گے۔

مندر کے باسیوں کو میری جدائی کسی طور گوارا نہ تھی۔ مگر مجبوری کا کیا علاج۔ سب لوگوں نے پھولوں کے ہار خریدے اور صبح سویرے مدن محل سٹیشن پر حاضر ہوئے۔ خورد وکلاں ٹھنڈی آہیں بھرتے تھے۔ انہوں نے مجھے دولہا بنا کر ڈھول تاشوں کے ساتھ میرا جلوس نکالا۔ میں بھی ایک ایک کے گلے سے لگ کر جدا ہوا۔

جبل پور سے لاہور مہاجر کیمپ پہنچ گیا اور پھر لاہور کیمپ سے رخصت ہو کر اپنے صدر دفتر پہنچا۔ پنڈی میں سروس مل گئی۔ چند روز کی چھٹی لے کر وطن پہنچا۔ اٹھارہ سال تک مزید سروس کی۔ بفضلہ تعالیٰ کسی چیز کی کمی نہیں۔ بینجو میں نے بطور

تحفہ پجارن کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ وہ بے چاری میرے ساتھ پاکستان آنے کی آرزومند تھی مگر میں اسے اس طوفان بلاخیز میں کیسے سنبھال سکتا تھا۔

پاکستان میں آکر میں نے دوسرا بینجو خرید لیا۔ پری زادوں کی زیارت اب بھی ہو جاتی ہے۔ شوق بھی پورا ہو رہا ہے اور دوستی بھی قائم ہے۔ دعا ہے کہ زندگی کے آخری ایام اسی بے فکری میں کٹ جائیں۔

☆☆☆

مقتول کی شادی

رام پور میں جمال علوی صاحب کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ ذرائع آمدنی میں کچھ زرعی زمین تھی' کچھ املی کے پیڑ۔ زندگی عزت سے بسر ہو رہی تھی۔

جمال علوی کے دو بڑے لڑکوں کی شادی ہو چکی تھی اور دونوں قریب کے ایک دیہات راجا پور میں رہتے تھے جہاں ان کا اجناس کا اچھا خاصا بیوپار تھا۔ وہ خود رام پور میں اپنی بیوی' ایک نوعمر لڑکے اور ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکی کے ساتھ رہتے تھے۔ لڑکی کا نام صاحبہ تھا۔

صاحبہ نہایت حسین و جمیل لڑکی تھی۔ چونکہ چار بچوں میں یہ اکیلی لڑکی تھی اس لئے ماں باپ اور بھائیوں کو بیحد عزیز تھی۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ ایک شام صاحبہ سارے دن کی جھلسا دینے والی گرمی سے پریشان ہو کر دیر تک ٹھنڈے پانی سے نہاتی رہی۔ مغرب سے کچھ پہلے وہ غسل خانے سے نکلی اور صحن میں پیپل کے پیڑ تلے ایک چارپائی پر بیٹھ کر بال خشک کرنے میں مصروف ہو گئی۔ علوی صاحب اس وقت چھوٹے لڑکے کو ساتھ لے کر کھیتوں پر گئے ہوئے تھے۔

اچانک صاحبہ چیخ مار کر زمین پر گر پڑی اور بیہوش ہو گئی۔ چیخ کی آواز سن کر ماں والان سے دوڑی ہوئی آئی۔ صاحبہ کو جو اس طرح بے ہوش پایا تو وہ چلا چلا کر رونے لگی۔ رونے کی آواز پر اڑوس پڑوس کے تمام لوگ اکٹھے ہو گئے۔ بڑی کوششوں سے صاحبہ کو ہوش تو آگیا لیکن وہ بالکل گم سم تھی۔ بار بار پوچھنے پر بھی وہ کپکپا کر محض اتنا بتا سکی کہ کسی نے اس کے کان میں سرگوشی میں کہا تھا۔

"صاحبہ۔ میری محبوب صاحبہ۔ تم کتنی اچھی ہو۔ لاؤ تمہاری عنبریں زلفوں کو میں خشک کر دوں۔"

اس کے بعد کیا ہوا؟ صاحبہ کو یاد نہیں تھا۔

علوی صاحب بھی آ گئے۔ انہوں نے جب یہ سارا قصہ سنا تو بیحد فکرمند ہو گئے۔ پھر لوگوں کے مشوروں سے دوسرے دن انہوں نے پیپل کا درخت کٹوا دیا۔ احتیاطاً" پیش امام صاحب سے تعویذ لکھوا کر انہوں نے اپنی لاڈلی بیٹی کے گلے میں ڈال دیا۔

یہ واقعہ جمعرات کو رونما ہوا تھا۔ اگلی جمعرات تک کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ لیکن اگلی جمعرات کو رات کے بارہ بجے کے قریب جب وہ اپنے والدین کے درمیان چارپائی پر سو رہی تھی تو اچانک چیخ مار کر بیدار ہو گئی۔ آواز سن کر سب جاگ پڑے صاحبہ نے خوفزدہ انداز میں کہا۔

"میں نے نیند میں اماں کی آواز سنی وہ کہہ رہی تھی۔ بیٹی تعویذ اتار کر میرے حوالے کر دو سوتے میں گر جائے گا۔ پھر کسی نے آہستہ سے میرے گلے سے تعویذ اتار لیا۔ میں سمجھی اماں ہیں۔ پھر کسی نے کہا۔ تم ادھر کروٹ بدل لو۔ ادھر ڈر جاؤ گی۔ ساتھ ہی کسی نے میرا شانہ پکڑ کر میری کروٹ بدلی۔ میں نے چونک کر دیکھا تو اپنے پاس ایک جوان آدمی کو لیٹے پایا۔ اماں اپنے پلنگ پر بے خبر سو رہی تھیں۔ میری گھگھی بندھ گئی۔ میں نے چیخنا چاہا تو جیسے آواز میرے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ پھر میں بڑی مشکل سے خوف پر قابو پا کر چیخی تو وہ اچانک غائب ہو گیا۔"

علوی صاحب نے گھبرا کر تعویذ کو دیکھا تو وہ گلے سے غائب تھا۔

اس کے بعد ہر جمعرات کی شام کو صاحبہ پر بیہوشی کے دورے پڑنے لگے۔ لاکھ علاج معالجے کرائے گئے۔ عاملوں کو دکھایا گیا مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ کسی نے کہا کہ گھر بدل دیا جائے تو آسیب کا اثر جاتا رہے گا۔ علوی صاحب نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور بیوی بچوں کو ساتھ لے کر اپنے بڑے بیٹوں کے پاس راجا پور منتقل ہو گئے لیکن وہاں بھی صاحبہ کی کیفیت وہی رہی اور دوروں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ لاکھ منت مرادیں مانی گئیں' صاحبہ کو مختلف بزرگوں کے مزاروں پر لے جایا گیا لیکن بیہوشی کے ہفتے وار دوروں میں کوئی فرق نہ آیا۔ آخر مجبور ہو کر جمال صاحب اسے بمبئی لے گئے تاکہ اچھے ڈاکٹروں سے علاج کروا سکیں۔ بمبئی میں دو تین مہینے تک لگاتار علاج ہوتا رہا مگر کسی قسم کا افاقہ نہ ہو سکا۔ ڈاکٹروں نے خیال ظاہر کیا کہ صاحبہ

ہسٹیریا کی مریضہ ہے۔ اگر اس کی شادی کر دی جائے تو مرض از خود جاتا رہے گا۔

علاج سے مایوس ہو کر جمال علوی لڑکی کو واپس رام پور لے آئے۔ شادی کے لئے سوال پیسے کا تھا۔ اب تک علاج معالجے پر روپیہ پانی کی طرح بہا چکے تھے۔ زمینیں اور املی کے پیڑ کب کے فروخت ہو چکے تھے۔ حتیٰ کہ گھر کے زیور بھی ختم ہو گئے تھے اور اب جمال علوی کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ صاحبہ کی شادی کے لئے روپیہ کہاں سے فراہم کیا جائے؟

انہوں نے فیصلہ کیا کہ منگنی کی رسم ادا کرنے کے بعد وہ اپنا مکان فروخت کر دیں گے اور جو بھی روپیہ پیسہ ملا وہ شادی میں صرف کر دیں گے۔ گزر بسر کے لئے اللہ کوئی نہ کوئی انتظام کر دے گا۔ یہ سوچ کر انہوں نے بڑے بیٹوں کو بلایا اور تمام صورتحال ان سے بیان کی۔ لڑکوں نے باپ کے فیصلے کی مخالفت کی اور کہا۔ "مکان فروخت کرنے کے بعد آپ کے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا اور اگر خدانخواستہ صاحبہ کی صحت پھر بھی ٹھیک نہیں ہوئی تو کیا ہو گا۔ ہمارا خیال ہے آپ شادی کی تیاری کریں جتنی رقم کی ضرورت ہو گی پوری کر دی جائے گی۔ آخر ہم بھی تو صاحبہ کے بھائی ہیں۔ آپ اس ذمے داری کو ہم پر چھوڑ دیں۔"

جمال علوی نہایت خوددار انسان تھے انہیں کسی طرح بھی بیٹوں کا سہارا لینا گوارا نہیں تھا مگر حالات ہی ایسے ہو گئے تھے کہ وہ بیٹوں کی امداد لینے پر تیار ہو گئے۔

شادی کا سوال پیچیدہ تھا۔ کس طرح کوئی بیمار لڑکی کو اپنے سر مول لیتا۔ جمال علوی نے بہت کوشش کی مگر جو بھی رشتہ آیا وہ اسی بات پر ختم ہو جاتا کہ لڑکی تو خوبصورت ہے پر بیمار رہتی ہے لہٰذا ہمیں منظور نہیں۔ حالانکہ علوی صاحب نے اپنی طرف سے کوئی شرط بھی عائد نہیں کی تھی۔ انہوں نے لڑکے کی تعلیم' عمر' رنگ روپ' صورت شکل اور ملازمت تک کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی پھر بھی کوئی شادی کے لئے تیار نہ ہوا۔

آخر علوی صاحب نے خاندان ہی کے ایک لڑکے کو یہ کہہ کر تیار کر لیا کہ اگر شادی کے ایک ماہ کے اندر لڑکی ٹھیک نہیں ہوئی تو وہ دوسری شادی کر لے۔ انہیں

کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ لڑکا تیار ہو گیا لیکن شادی سے صرف دو دن قبل بغیر کوئی عذر بتائے انکار کر دیا۔ علوی صاحب کے گھر والوں نے بہت کچھ خوشامد کی مگر وہ کسی قیمت پر تیار نہ ہوا۔

اس واقعے کے سال بھر بعد صاحبہ کے ماموں زاد بھائی عارف نے اس سے شادی کے لئے اپنی رضامندی ظاہر کی۔ آخری وقت تک وہ اپنے فیصلے پر جما رہا لیکن نکاح سے صرف ایک دن قبل رات کو سوتے میں کسی نے عارف کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر دیا۔ شادی کی محفل ماتم کدہ بن گئی۔ پورے خاندان پر غم و اندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

عارف کی موت کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ شادی سے دو دن پیشتر ایک گھوڑا سوار آیا تھا۔ اس نے عارف سے تنہائی میں کچھ باتیں کیں پھر ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما کر اسے ہدایت کی۔ "یہ لفافہ میری روانگی کے بعد کھولا جائے۔" جب گھوڑا سوار چلا گیا تو عارف نے لفافہ چاک کیا۔ اندر تحریر تھا۔

"ہمیں پتہ چلا ہے آپ صاحبہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اس کام کا ارادہ چھوڑ دیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ خط دیکھتے ہی فوراً شادی سے انکار کر دیں گے ورنہ بصورت دیگر.....

یہ بات صرف آپ کے اور ہمارے درمیان ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے اس کے تذکرے سے صاحبہ کی رسوائی کے سوا اور کچھ نہ ہو گا۔"

عارف نے اس خط کو کوئی اہمیت نہ دی اور یہ کہہ کر پولیس کے حوالے کر دیا کہ میں ان گیدڑ بھبکیوں سے ڈرنے والا نہیں۔ یہ خط اسی رات کہ جب عارف کا قتل ہوا پولیس کی فائل سے پراسرار طریقے سے گم ہو گیا۔ پولیس اس تحریر کے غائب ہونے سے عرصے تک پریشان رہی، کافی چھان بین ہوئی، پکڑ دھکڑ ہوئی لیکن قاتل ہاتھ نہ آیا۔

دو سال گزر گئے۔

یہ تلخ واقعات کافی حد تک ذہنوں سے محو ہو گئے۔ خاندان والوں کا غم بھی کسی قدر غلط ہو گیا تو جمال علوی کو پھر صاحبہ کی شادی کی فکر لاحق ہوئی مگر اس مرتبہ اس

میں وہ زور شور نہیں تھا جو پہلے کبھی تھا۔ پھر بھی شادی تو کرنی ہی تھی لہٰذا ایک بار پھر وہی سلسلہ چل پڑا لیکن اب نسبت کی بات چیت تو درکنار کوئی صاحبہ کا نام تک سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ جمال علوی اور ان کے بیٹوں نے ہر طرف ہاتھ پیر مارے مگر بےسود۔ آخر تھک ہار کر بیٹھ گئے۔

وہ رمضان کی پندرہ تاریخ اور جمعرات کا دن تھا۔ شام کے وقت ایک فقیر نے علوی صاحب کے دروازے پر صدا لگائی۔ صاحبہ کی ماں نے خیال کیا، کیوں نہ صاحبہ کے ہاتھ سے فقیر کو افطاری دلوائی جائے۔ چنانچہ انہوں نے فوراً ایک برتن میں سلیقے سے افطاری رکھ کر صاحبہ کے ہاتھ سے فقیر کو دلوائی اور خود دروازے کی اوٹ سے کہا۔

"بابا ہم لوگ بے حد دکھی ہیں۔ آپ میری لڑکی کے لئے دعا کریں کہ اس کی بیماری دور ہو جائے۔"

یہ سن کر فقیر نے دعا دی اور کہا۔

"بہن پریشان نہ ہو۔ تمہاری لڑکی پر سے نحوست کا سایہ ہٹ گیا ہے۔ اب سب کام ٹھیک ہو جائیں گے۔" اتنا کہہ کر فقیر نے اپنی راہ لی۔

چار مہینے گزر گئے۔ بقر عید کے دوسرے دن علوی صاحب کے ایک پرانے دوست شکیل الدین ملاقات کی غرض سے تشریف لائے۔ وہ صرف ایک دن کے لئے آئے تھے۔ شام تک وہ اور جمال علوی ایک دوسرے سے باتوں میں منہمک رہے۔ شام کو باتوں باتوں میں علوی صاحب نے ان کو اپنی پوری داستان سنائی اور ان سے درخواست کی کہ وہ صاحبہ کے لئے کوئی مناسب رشتہ تلاش کریں۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ جلد از جلد بہتر سے بہتر رشتہ تلاش کر کے جمال علوی کو خط لکھیں گے۔

رات کا کھانا کھا کر شکیل الدین واپس روانہ ہو گئے۔ کوئی ایک ہفتے بعد جمال علوی کے نام ان کا خط آیا۔ انہوں نے لکھا تھا۔

"حسب وعدہ میں نے صاحبہ بی بی کی شادی کی بات چیت طے کر لی ہے۔ لڑکے کا نام سرفراز علی ہے اور وہ نصیر آباد کے جاگیردار کا اکلوتا بیٹا ہے۔ لڑکا مجھے بیحد پسند ہے اور گھرانا بھی اعلیٰ ہے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ تم اس سلسلے میں پچھلے تجربوں کی روشنی

میں اس امر کا تذکرہ کسی سے نہ کرو۔ لڑکے کے وہاں پہنچتے ہی فوراً" نکاح پڑھوا دو۔
کسی قسم کے لین دین کی ضرورت نہیں لڑکا ۱۲ چاند کو رام پور پہنچے گا۔"

خط کا آنا تھا کہ جمال علوی خوشی سے کھل اٹھے۔ چہرے سے پریشانی یک لخت دور ہو گئی۔ اس بار انہوں نے بڑی رازداری سے کام لیا اور گھر والوں کے سوا اس بات کا پتا کسی کو بھی نہیں چلنے دیا۔

۱۲ چاند کو علوی صاحب نے نکاح پڑھنے کے لئے قاضی کو بلوایا۔ صاحبہ کو دوپہر کے بعد شادی کا جوڑا پہنا دیا گیا۔ جمال علوی کی بیوی بیٹی کو بیاہ کے جوڑے میں دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی اور ہاتھ اٹھا کر بار بار شکیل الدین کو دعائیں دیتی تھی۔

کوئی پانچ بجے کے لگ بھگ شام کو ایک تانگا مکان کے سامنے آ کر رکا۔ تانگے سے ایک بوڑھا نوکر اور ایک خوبصورت نوجوان جو قیمتی کپڑوں میں ملبوس تھا اترا۔ نوکر نے آگے بڑھ کر علوی صاحب سے نوجوان کا تعارف کرایا۔

"صاحب۔ یہ چھوٹے نواب سرفراز علی ہیں اور میں ان کا خادم شریف۔"

علوی صاحب کے کان میں شریف نے چپکے سے کچھ اور بھی کہا۔ جس کے جواب میں علوی صاحب نے اثبات کے طور پر اپنا سر ہلایا۔ غالباً" اس نے قاضی کے سلسلے میں استفسار کیا تھا اور علوی صاحب نے بتایا تھا کہ سب کچھ تیار ہے۔

سرفراز کی آمد کے تھوڑی دیر بعد ہی قاضی نے نکاح پڑھا دیا۔ محلے والوں کو اس کی اطلاع اس وقت ہوئی جب نکاح ہو چکا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ نکاح جمعرات کو ہوا تھا اور جمعرات کے روز ہی صاحبہ پر بیہوشی کا دورہ پڑتا تھا لیکن آج صاحبہ پر کوئی دورہ نہیں پڑا اور وہ اپنی شادی پر مسرور و شادمان تھی۔

دوسرے دن شکیل الدین کی ہدایت کے مطابق جمال علوی نے دولہا اور دلہن کو واپس روانہ کر دیا۔ سٹیشن پر ان کو رخصت کرتے وقت جمال علوی اور ان کے تینوں لڑکے موجود تھے۔ گاڑی کی روانگی کے وقت جمال علوی آبدیدہ ہو گئے۔ انہوں نے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور داماد کو سینے سے لگا کر کہا۔

"بیٹا۔ صاحبہ میری اکلوتی بیٹی ہے۔ اسے میں نے بڑے لاڈ سے پالا ہے۔ اس

کو دیکھ کر میں اپنی پریشانیاں اور غم بھول جاتا تھا' اب اپنی نور نظر کو تمہیں سونپ رہا ہوں۔ اس کا خیال رکھنا بیٹا۔ اگر یہ کوئی بات تمہاری مرضی کے خلاف کرے بھی تو درگزر کر دینا۔ ابھی بچی ہے۔ ناسمجھ ہے۔ رفتہ رفتہ سمجھ بھی آ جائے گی۔ اچھا۔ تم دونوں کو خدا کے سپرد کیا اور ہاں پہنچتے ہی خیریت کا خط لکھ دینا اور ویسے بھی دوسرے تیسرے دن خط لکھتے رہنا ورنہ ہمیں ایک پل چین نہ آئے گا۔"

سرفراز نے کہا۔

"اباجان۔ آپ قطعی فکر نہ کریں' میں صاحبہ کو ہمیشہ خوش رکھوں گا۔"

پھر وہ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں چڑھ گیا۔ انجن نے سیٹی دی اور ایک جھٹکے سے گاڑی پلیٹ فارم کے ساتھ رینگنے لگی۔

پلیٹ فارم پر جمال علوی' صاحبہ کے ڈبے کے ساتھ ساتھ دور تک دوڑتے رہے پھر ٹرین نے رفتار پکڑ لی۔

بیٹی کی رخصتی کے ایک ہفتے کے بعد جمال علوی کو صاحبہ کا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا۔

"اباجان آداب۔

آپ سے رخصت ہونے کے بعد ہم رات کو بارہ بجے سٹیشن پہنچے۔ ہمیں لینے کے لئے ایک نوکر تانگا لئے سٹیشن پر موجود تھا۔ گاڑی سے اتر کر ہم لوگ سیدھے سرفراز باغ روانہ ہوئے۔ سرفراز باغ کوئی تین میل کے فاصلے پر ایک نہایت ہی حسین باغ ہے۔ باغ کے درمیان سرفراز کا عالیشان محل ہے۔

آپ میری بابت فکر نہ کیجئے گا۔ میں آرام سے ہوں۔ بہت ہی نیک طبیعت کے ہیں۔ جب سے یہاں آئی ہوں میرا ہر طرح خیال رکھتے ہیں۔ نوکروں کو بھی ہدایت ہے میرا خاص خیال رکھیں۔

ابا کا ایک پیر کٹا ہوا ہے بیچارے تمام دن پہیوں والی کرسی پر بیٹھے گھومتے رہتے ہیں۔ امی بھی بہت اچھی ہیں مگر وہ ہر وقت اپنے کمرے میں خاموش بیٹھی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی آواز دے کر مجھے بلا لیتی ہیں اور دیر تک باتیں کرتی رہتی ہیں۔

اماں جان اور بھائیوں کی خدمت میں میرا آداب کہئے گا۔ وہ آپ کو آداب

کہتے ہیں۔"

رمضان کا مہینہ آ گیا۔ جمال علوی کو ہر ہفتے صاحبہ کا خط اور خیریت ملتی رہتی تھی۔ لیکن اب ان کا اور ان کی بیوی کا جی اپنی بیٹی اور داماد کو دیکھنے کے لئے بیتاب تھا۔ چنانچہ انہوں نے دونوں کو عید منانے کے لئے اپنے پاس بلایا۔ عید آئی اور گزر گئی لیکن صاحبہ اور سرفراز نہیں آئے البتہ ان کا ایک عید کارڈ علوی صاحب کو ملا جس میں عید کی مبارکباد کے ساتھ یہ بھی تحریر تھا کہ وہ بڑے نواب صاحب کی خرابی صحت کی بنا پر نہ آ سکے۔ سرفراز نے اس پر بیحد معذرت چاہی تھی۔

عید کے کوئی ایک ہفتے بعد جمال علوی نے سوچا کہ بیچارے نواب واجد پیر سے معذور ہیں اور ان دنوں علیل بھی ہیں کیوں نہ میں خود جا کر ان سے مل آؤں' صاحبہ کو بھی دیکھ لوں گا اور ان کی عیادت بھی ہو جائے گی۔ شکیل الدین کا بھی شکریہ ادا کروں گا۔ یہ سوچ کر انہوں نے سرفراز کو لکھ بھیجا کہ میں اتوار کو نواب واجد کی عیادت کی غرض سے آ رہا ہوں۔ بہتر ہے میرے لینے کے لئے سٹیشن پر کوئی آ جائے۔

خط ڈاک کے حوالے کر کے جمال علوی نے روانگی کی تیار شروع کر دی اور اتوار کو نصیراباد کے لئے روانہ ہو گئے۔ سٹیشن پر علوی صاحب کو لینے کے لئے صاحبہ اور سرفراز موجود تھے۔ اس وقت علوی صاحب کو یوں محسوس ہوا جیسے دونوں کچھ بجھے بجھے سے ہوں۔ وہ ان کے ساتھ تانگے پر سوار ہو گئے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ جب وہ سرفراز باغ میں داخل ہوئے تو رات کا ڈیڑھ بجا تھا۔ فضا رات کی رانی اور چمپا کی مہک سے بوجھل تھی۔ چاندنی بڑے تناور درختوں کی شاخوں سے چھن چھن کر زمین پر گر رہی تھی اور ہلکی ہلکی ہواؤں میں سیماب کی طرح تھرتھرا رہی تھی۔

محل میں نواب واجد ان کے استقبال کے لئے اپنی پہیوں والی کرسی پر برآمدے کے زینے کے قریب موجود تھے۔ کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے وہ بڑے تپاک سے علوی صاحب سے ملے۔ ہر طرف بڑے بڑے فانوس روشن تھے اور دیواروں پر جگہ جگہ پنج شاخے جگمگا رہے تھے۔ علوی صاحب کو پہلے کمرہ نشست میں بٹھایا گیا جس کے

بیچوں بیچ منقش چوبی چھت سے ایک عالیشان فانوس لٹک رہا تھا۔ فرش پر دبیز ایرانی قالین بچھا تھا اور صوفے اور کوچ عنابی مخمل سے ڈھکے ہوئے تھے۔

نواب صاحب نے علوی صاحب کو کافی پیش کی۔ علوی صاحب نے معذرت چاہی لیکن نواب صاحب نہ مانے اور انہیں کافی پینی پڑی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ان کے سامنے میز پر ہلکا سا ناشتہ چن دیا گیا۔ ناشتے میں جمال علوی کے ساتھ سرفراز اور صاحبہ بھی شامل رہے۔ ناشتے کے دوران نواب واجد نے شادی میں شرکت نہ کرنے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"بھائی صاحب میں شادی میں ضرور شریک ہوتا لیکن شکیل الدین نے منع کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ جمال صاحب کو جلدی بہت ہے صرف لڑکے کو بھجوا دیں۔ گھر کی بات ہے اور لین دین کا بھی کوئی سوال نہیں۔ چنانچہ میں نے ان ہی کے کہنے پر عمل کیا۔"

جمال علوی نے کہا۔

"کوئی بات نہیں بھائی صاحب۔ لڑکا بھی آپ کا ہے اور لڑکی بھی آپ ہی کی ہے۔ افسوس اتنا ضرور ہے کہ آپ اپنے اکلوتے بچے کی شادی میں شریک نہیں ہو سکے۔ بہرحال آپ اس بات پر آزردہ نہ ہوں۔"

تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد جمال علوی' نواب صاحب سے اجازت لے کر سونے کے لئے اپنے کمرے میں آ گئے۔ ان کا کمرہ بھی نشست گاہ کے برابر ہی تھا۔ نیند تو غائب ہو ہی چکی تھی۔ دونوں باپ بیٹی بیٹھے باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ فضاؤں میں اذانوں کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اس وقت سرفراز کمرے میں آیا اور صاحبہ سے بولا۔

"صاحبہ صبح ہو رہی ہے۔ ابا کو تھوڑی دیر آرام کر لینے دو۔"

اس پر صاحبہ باپ سے اجازت طلب کر کے سرفراز کے ساتھ چلی گئی اور علوی صاحب آرام کی غرض سے بستر پر لیٹ گئے۔ ان کے کپڑوں کا صندوق اور بستر بند اسی طرح لپٹا ہوا کونے میں رکھا رہا۔ بستر پر لیٹتے ہی وہ ایسے غافل ہو کر سوئے کہ دنیا و مافیہا کا ہوش نہ رہا۔

جمال علوی ابھی اور سوتے مگر منہ پر کسی پرندے کی بیٹ گرنے سے ہوشیار ہو گئے۔ اب جو دیکھا تو نہ وہ کمرہ ہے نہ وہ دبیز قالینوں والا فرش' بلکہ ایک بڑے برگد کے پیڑ تلے ایک نو تعمیر قبر سے ٹیک لگائے لیٹے ہیں۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

شروع شروع میں تو ان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کہاں ہیں اور کیسے آ پہنچے۔ وہ آنکھیں پھاڑے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ جہاں وہ تھے' وہ ایک باغ کا ایک ویران گوشہ تھا اور وہاں برابر برابر کئی قبریں بنی ہوئی تھیں۔ وہ جس قبر سے ٹیک لگائے تھے اس سے ملی ہوئی تین اور شکستہ قبریں تھیں۔ علوی صاحب کے پہلو میں ان کا صندوق اور بستر بند جوں کا توں رکھا تھا۔

رفتہ رفتہ ان کا ذہن کام کرنے لگا۔ انہیں رات کے تمام واقعات یاد آنے لگے۔ صاحبہ کا خیال آتے ہی ان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یکایک ان کی نگاہ نو تعمیر قبر کے تعویذ پر پڑی اور پھر جیسے ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تعویذ پر یہ عبارت کندہ تھی۔

صاحبہ زوجہ سرفراز علی
تاریخ انتقال
۱۲ ذی قعدہ ۱۴۰۰ھ بروز جمعرات

قریب تھا کہ جمال علوی اس صدمے سے بیہوش ہو جاتے لیکن انہوں نے بڑی مشکل سے دل کو سنبھالا اور اٹھ کر چاروں طرف کا جائزہ لینے لگے۔ دیکھا تو ویران باغ کے درمیان ایک کھنڈر ہے۔ ٹوٹے ہوئے درودیوار اور بوسیدہ محرابیں۔ پھر ان کی نگاہیں ایک شکستہ حال کمرے پر پڑیں۔ قریب جا کر دیکھا تو اس کی دیواروں میں شگاف پڑے تھے اور چھت بھی جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ کمرے کے دروازے پر ایک زنگ آلود قفل لگا تھا۔ کواڑوں کو دیمک چاٹ رہی تھی۔ ایک دراڑ میں سے انہوں نے اندر جھانکا تو سامنے دیوار پر دھول میں اٹی ایک قد آدم تصویر نظر آئی۔ غور سے دیکھنے پر انہوں نے تصویر کو پہچان لیا۔ یہ سرفراز کی تصویر تھی۔ پریشان حال' سامان ہاتھوں میں اٹھائے وہ ڈگمگاتے قدموں سے چلتے ویرانے

سے نکل کر سڑک پر آئے تو دیکھا دور دور تک آبادی کا پتہ نہیں تھا۔ وہ سڑک پر ایک سمت کو چل دیئے۔ تھوڑی دیر بعد مخالف سمت سے انہیں ایک سائیکل سوار آتا نظر آیا۔ علوی صاحب نے اسے روک کر نصیر آباد کا پتہ پوچھا۔ اس نے کہا۔

"آپ اس سڑک پر جدھر جا رہے ہیں اسی طرف چلے جائیں۔ یہاں سے کوئی تین میل فاصلے پر نصیر آباد ہے۔"

پھر جمال علوی نے سائیکل سوار سے سرفراز باغ کے متعلق دریافت کیا تو اس نے کہا۔

"آپ کس باغ کی بابت دریافت کر رہے ہیں؟ کیا لنگڑے نواب والے باغ کو پوچھ رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔" جمال علوی نے کہا۔

"وہ یہی تو ہے جدھر سے آپ آئے ہیں۔"

یہ کہہ کر سائیکل سوار نے غور سے جمال علوی کو دیکھا اور پھر سائیکل گھما کر اس طرف واپس ہو گیا جدھر سے آیا تھا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا اور تیزی سے پیر چلا رہا تھا۔ جمال علوی نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ یہ جا وہ جا۔ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ جمال علوی تھکے تھکے سے نصیر آباد کی طرف روانہ ہو گئے۔

نصیر آباد میں پوچھتے پاچھتے وہ شکیل الدین کے گھر پر پہنچے اور اسے آواز دی۔

"کون صاحب ہیں؟" اندر سے ایک زنانہ آواز آئی۔

"میں ہوں جمال علوی۔ رام پور سے آیا ہوں۔"

شکیل الدین کی بیوی نے کہا۔

"بھائی۔ وہ تو گذشتہ بقر عید کو آپ ہی سے ملنے رام پور جا رہے تھے کہ راستے میں ریل سے کٹ کر ہلاک ہو گئے؟"

علوی صاحب یہ سن کر لرز گئے اور پھر انہوں نے بڑی بے چینی سے شکیل الدین کی بیوی کو ایک ہی سانس میں تمام داستان سنا دی۔

"کیا فرما رہے ہیں آپ بھائی۔" بیگم شکیل نے کہا۔ "نواب واجد اور سرفراز کو تو اب سے چالیس سال قبل کسی نے قتل کر دیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے سرفراز کی شادی

کے انتظامات میں مصروف تھے لیکن شادی سے ایک روز قبل کسی نے ان کو اور سرفراز دونوں کو قتل کر دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ قاتل نے دونوں کے سرتنوں سے جدا کر دیئے تھے۔ پھر حکومت نے سرفراز باغ کی حویلی کو مقفل کر دیا کیونکہ نواب واجد کا کوئی وارث نہیں تھا اور اب تو سرفراز باغ بالکل ویران پڑا ہے' شام کے بعد کوئی ادھر کا رخ بھی نہیں کرتا۔ سب کہتے ہیں سرفراز باغ آسیب زدہ ہے۔"

جمال علوی کی نگاہوں میں اچانک صاحبہ کا معصوم چہرہ گھوم گیا اور وہ وقت جب وہ سٹیشن پر اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے نصیر آباد کے لئے رخصت کر رہے تھے۔ فرط غم سے ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ وہ لڑکھڑا کر وہاں سے پلٹے لیکن چند قدم چل کر زمین پر گر پڑے۔ اب اٹھتے بھی تو کس کے لئے؟

☆☆☆

جن کا عشق

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا میں نفسیاتی مریض ہوں؟ میرے خیالات ایسے کیوں ہیں؟ کیا مجھے کوئی عارضہ لاحق ہو گیا ہے؟ نہیں۔ مجھے کچھ بھی تو نہیں ہوا ہے۔ میں تو صرف آج سے بائیس برس پہلے کے اس مافوق الفطرت واقعہ کی یاد تازہ کرنے لگا تھا جسے میں بھول جانا چاہتا ہوں لیکن بھلا نہیں سکتا۔ جس کو بھولنے کے لئے میں خود کشی تک کے لئے تیار ہوں لیکن کر نہیں سکتا۔ دنیا میں انسان بے شمار حادثات کا شکار ہوتا ہے۔ ہر حادثہ اپنی جگہ انفرادی حیثیت رکھتا ہے اور انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن میرا حادثہ دنیا کے عام حوادث سے کچھ ہٹ کر ہے۔ جس کو یاد کرتے ہی مجھ پر وحشت طاری ہو جاتی ہے۔

زندگی بہت پر سکون تھی۔ گھر کا ماحول خوشگوار تھا۔ میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہوں۔ تعلیم کے سوا میرا کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ گھر سے سکول جانا اور سکول سے گھر۔ آوارہ پھرنے کی عادت نہیں تھی۔ میں نے میٹرک میں وظیفہ حاصل کیا۔ گھر کا ہر فرد خوش آئند مستقبل کے تصور سے محظوظ ہو رہا تھا لیکن کسی کو کیا معلوم کہ اس خوشی کے پیچھے ایک ایسا حادثہ پوشیدہ ہے جو پورے خاندان پر اثر انداز ہو گا۔ مجھے کالج میں داخلہ مل گیا۔ میں کالجیٹ بن گیا۔ زندگی پھر بھی تعلیم تک محدود رہی۔ دوستی صرف چند ایک آدمیوں سے تھی۔ وہ بھی مناسب حد تک۔ بول چال کلاس کے ہر فرد سے تھی۔ کسی کو مجھ سے کوئی گلہ شکوہ نہیں تھا۔ ہر امتحان میں اول آتا۔ اس لحاظ سے بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ اسی طرح دو سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔ امتحانات ہوئے' نتیجہ آیا اور مجھے تھرڈ ایئر میں ایک نہایت اچھے کالج میں داخلہ مل گیا۔

ان گزشتہ دو سال کے دوران کوئی ناخوشگوار حادثہ پیش نہ آیا لیکن اندر ہی اندر میرے مزاج میں نہایت عجیب قسم کی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ میں نے مستقل ڈائری لکھنی شروع کر دی۔ تنہائی پسند ہو گیا۔ کسی سے نہ ملتا۔ خود کو گھر کا فرد نہ

سمجھتا اور کسی بھی گھریلو معاملے میں دخل نہ دیتا۔ گھر میں کوئی خوشی ہو یا غمی مجھے اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ چھوٹے بھائی میرے سامنے جھگڑتے لیکن میں اپنے حال میں مگن رہتا۔ خوشیوں سے مجھے نفرت ہوتی گئی۔ غموں میں مجھے مزہ آنے لگا۔ یقین جانئے میں اسقدر تبدیل ہو گیا کہ غموں میں مجھے لذت ملنے لگی۔ کالج سے گھر آتا تو صرف ایک خواہش ہوتی کہ اے خدا۔ گھر جاتے ہی مجھے کوئی ایسا غم دے جس سے بس مزہ ہی آ جائے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ لذت بھی مجھے مطمئن نہ کر پاتی۔

غموں کا اس قدر عادی ہو گیا کہ غم سے وہ خوشی حاصل نہ ہوتی جس کی میں توقع رکھتا۔ خاندان کے تمام عزیز مجھے سب سے زیادہ پیار کرتے لیکن مجھے سب سے نفرت ہو گئی۔ والدہ صاحبہ مجھے سب سے زیادہ پیار کرتیں لیکن وہ اس کا بار بار اظہار نہ کرتیں۔ مجھے اپنے والد سے ہمدردی تھی۔ میں انہیں نہایت عاجز سمجھتا۔ سوچتا یہ بھی کتنے عظیم ہیں کہ میری والدہ جیسی عورت سے نباہ کر رہے ہیں جو برسوں سے بیمار ہے۔ جسم کانٹا ہے' بیماری کی وجہ سے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہو گیا ہے لیکن پھر بھی اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔

ایک دن حسب معمول میں کالج سے گھر آیا تو والد صاحب کہنے لگے کہ چلو آج ایک آدمی کے پاس چلیں وہ ہاتھ دیکھنے میں بہت ماہر ہے۔ میں والد صاحب کے اس رویے پر بہت حیران ہوا۔ کیونکہ ہمارے گھر میں کوئی شخص بھی ہاتھ دکھانے یا تعویز گنڈے اور جادو وغیرہ پر یقین نہ رکھتا تھا۔ خیر والد صاحب کے کہنے پر میں ان کے ساتھ ہو لیا اور ہم اس آدمی کے پاس پہنچ گئے۔ یہ صاحب میرے والد کے ماتحت کام کرتے تھے اور فارغ اوقات میں تعویز گنڈا بھی کرتے جس کا باقاعدہ وہ ہدیہ بھی لیتے۔ انہوں نے میرا ہاتھ دیکھا اور ہاتھ پر پین سے دو لائنوں پر نشان لگاتے ہوئے کہا کہ تم پر جادو کیا گیا ہے۔ وہ بھی ایک نے نہیں بلکہ دو افراد نے۔ میں ایسی باتوں پر یقین نہ رکھتا تھا۔ اس لئے میں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر وہ صاحب کہنے لگے کہ اگر تم کو مجھ پر یقین نہیں تو کسی بھی پامسٹ کے پاس چلے جاؤ اور اس سے پوچھو کہ یہ لکیریں کیا ظاہر کرتی ہیں۔ خیر میں چپکے سے گھر آ گیا اور اس واقعہ کو بھی بھول گیا۔ گھر آ کر میں نے یہی کہا کہ یہ لوگ تو سب کو یہی کہتے ہیں کہ تم پر جادو کیا

گیا ہے۔ چاہے وہ بیماری ہی ہو۔ لیکن گھر والے مجھ سے متفق نہیں تھے۔ ہمارے خاندان والے ہم سے بہت جلتے تھے کہ یہ اچھا کھاتے پیتے ہیں اور ان کی اولاد زیور تعلیم سے آراستہ ہو رہی ہے۔ یہ لوگ جادوگر کہلاتے تھے۔ تعویذ گنڈے وغیرہ کروانا ان کی عادت تھی۔ ہم اگرچہ ان کے ان کاموں سے واقف تھے لیکن چونکہ ہمیں ان چیزوں پر یقین نہیں تھا اس لئے ہم کوئی پروا نہ کرتے۔

دو ماہ گزر گئے۔ عید پر ہم اپنے ایک قریبی عزیز کے ہاں چلے گئے۔ عید کے تین دن بعد ایک صاحب وہاں تشریف لائے۔ یہ ان کے دوست شاہ صاحب تھے۔ نہایت چھوٹی عمر۔ حال ہی میں بی اے کیا تھا۔ اپنا کاروبار کرتے تھے لیکن "نوری علم" سے بھی گہرا شغف تھا۔ مجھے ان کے سامنے لے جایا گیا اور کہا گیا کہ ذرا اسے دیکھئے کہ کیا بات ہے۔ روز بروز صحت گر رہی ہے۔ دوسرے ہمیں یہ شک ہے کہ اس پر کسی نے کچھ کر دیا ہے۔ میں نے پھر وہی کہا کہ مجھے کچھ نہیں ہوا لیکن اس دفعہ میری شنوائی نہ ہوئی۔

میرے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک تعویذ دے کر بٹھا دیا گیا اور کہا گیا کہ ہاتھ کو بند کر کے زور سے دبائیں اور ہاتھ سامنے رکھیں۔ آنکھیں بھی بند کر دی گئیں۔ پھر انہوں نے کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونکنا شروع کر دیا۔ اس طرح چند منٹ گزر گئے پھر پوچھنے لگے۔

"کیوں بھائی کچھ نظر آیا؟؟"

میری آنکھیں بالکل بند تھیں اور سوائے تاریکی کے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اس لئے میں نے انہیں بتایا کہ پپوٹے بوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ اس پر انہوں نے دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ میرے دونوں ہاتھوں پر ہزاروں من بوجھ پڑ گیا اور اس بوجھ تلے ہاتھوں نے اوپر نیچے حرکت شروع کر دی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ حرکت اس قدر تیز ہو گئی کہ ہاتھوں نے گول دائرے میں گھومنا شروع کر دیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ مجھ میں کچھ ہے۔ شاہ صاحب نے فوراً" حکم دیا کہ جو کوئی ہے' سامنے آ جائے۔ خبردار۔ جو ہاتھوں کو ذرا جنبش دی۔

ہاتھ خود بخود رک گئے۔ لیکن مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ ہاتھوں کی جنبش پھر شروع

ہو گئی۔ میں لاکھ کوشش کرتا کہ ہاتھ نہ ہلیں لیکن میں بے بس تھا۔ میرے ہاتھ میرے بس میں نہیں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی اور قوت انہیں بڑی تیزی کے ساتھ گھما رہی ہے۔ یہ حرکت پچاس راؤنڈ فی سیکنڈ سے کسی صورت بھی کم نہ تھی۔ اب ایک عجیب تماشا ہوا۔ شاہ صاحب کہتے کہ جنبش روکو۔ لیکن ہاتھوں کی حرکت تیز ہو جاتی۔ اگر دایاں ہاتھ حرکت کرتا اور وہ اسے رکواتے تو بایاں حرکت کرنے لگتا اور اگر وہ اسے روکتے تو دونوں حرکت کرنے لگتے۔ یہ عمل کوئی پون گھنٹہ جاری رہا۔ شاہ صاحب تنگ آ گئے۔ کہنے لگے۔

"آنکھیں بند کر کے تاریکی میں کچھ دیکھنے کی کوشش کرو۔ میں دیکھ رہا ہوں جو کچھ ہے لیکن تم کیسے کہتے ہو کہ تمہیں نظر نہیں آتا۔"

میں نے پھر نفی میں جواب دیا۔ آخر تنگ آ کر وہ کہنے لگے کہ اس کا مطلب ہے کہ تم ہم سے مذاق کر رہے ہو۔ تم ہاتھوں کو جان بوجھ کر حرکت دے رہے ہو۔ لیکن یہ غلط تھا۔ میرے ہاتھوں کو گھمانے والی طاقت کوئی اور تھی جو میرے بس سے باہر تھی۔ آخر انہوں نے مجھ سے تعویذ لے لیا اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔

ہاتھوں کی حرکت سے سب گھر والے جو اردگرد بیٹھے یہ منظر دیکھ رہے تھے' خاصے پریشان تھے۔ لیکن مجھے اب بھی یقین نہیں تھا۔ میں کہہ رہا تھا کہ چونکہ ہاتھ سامنے کی طرف پھیلائے ہوئے تھے' اس لئے زیادہ دیر تک میں انہیں قابو میں نہ رکھ سکا۔ وجہ یہ تھی کہ مجھے خود پہ اختیار نہ تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھ سے یہ حرکت سرزد ہوتی رہی۔ میں بے بس ہو چکا تھا اور اس وجہ سے وہ حرکت کرنے لگے --- لیکن دوسری طرف شاہ صاحب فرما رہے تھے کہ اس پر کسی باہر کی چیز کا سایہ ہے جو بڑی عالم فاضل معلوم ہوتی ہے جو اس طرح قابو میں نہیں آتی۔ چونکہ میرے پاس ہتھیار (تعویذ) نہیں تھا۔ اس لئے لڑتا گیا۔ آج رات میں بیٹھ کر تعویذ بناؤں گا اور صبح پھر اسے دیکھوں گا۔

دوسرے روز والد صاحب واپس چلے گئے۔ ان کی چھٹی ختم ہو گئی تھی۔ مجھے تاکید کر دی گئی کہ میں اپنے عزیز کے ہمراہ جا کر ان کو دوبارہ ملوں اور صورتحال سے مطلع کروں۔ صبح نو بجے ہم شاہ صاحب کی دوکان پر چلے گئے۔ انہوں نے اپنا کام

چھوڑ کر میرے ہاتھوں میں تعویذ دے دیئے اور پڑھنا شروع کر دیا۔ میرے ہاتھوں نے پھر اسی طرح جنبش شروع کر دی لیکن یہ کوئی آدھ منٹ رہی ہو گی۔ اس کے بعد میرے جسم نے کانپنا شروع کر دیا۔ گرمیوں کا موسم تھا اور مجھے کسی قسم کی کوئی سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میری گردن سے نیچے اور ٹانگوں سے اوپر کا حصہ بری تیزی کے ساتھ حرکت کر رہا تھا۔ جب شاہ صاحب ذرا بگڑتے تو یہ حرکت بند ہو جاتی۔ خیر کوئی دس منٹ کے بعد انہوں نے مجھے پوچھا کہ کچھ نظر آیا؟ مجھے سوائے ایک ستون کے کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ ستون بھی کیا تھا ایک مینار معلوم ہوتا تھا۔ میں اس کا اوپر کا سرا دیکھنا چاہتا تھا جو نظروں سے اوجھل تھا۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس ستون کی لمبائی کتنی ہو گی۔

شاہ صاحب نے مجھ سے کہا کہ اپنے دل میں کہو کہ جو کوئی بھی ہے اپنی اصلی حالت میں سامنے آئے۔

میں نے یہی دہرایا لیکن سوائے ستون کے کچھ نظر نہ آیا۔ اس پر شاہ صاحب نے میرے سامنے ایک اور تعویذ رکھ دیا اور کہا کہ اس سے کہو کہ اگر تم طاقتور ہو تو اس تعویذ کو الٹا کر دو ورنہ تم ہماری اطاعت قبول کر لو۔

یاد رہے کہ شاہ صاحب تمام سوالات میرے ذریعے کرتے تھے۔ ایک تعویذ انہوں نے اپنے سامنے رکھا ہوا تھا جس میں وہ سب کچھ دیکھ رہے تھے یعنی یہ ان کا "ریڈار" تھا۔ جونہی انہوں نے میرے سامنے تعویذ رکھا۔ میری آنکھوں کے سامنے روشنی ہی روشنی ہو گئی' اتنی زیادہ کہ دن کو بھی اتنی روشنی نہ دیکھی تھی۔ اگرچہ میری آنکھیں بند تھیں۔ لیکن تعویذ کا ایک ایک لفظ مجھے واضح طور پر نظر آ رہا تھا اور میں اسے بڑی آسانی کے ساتھ پڑھ سکتا تھا۔ کسی غیبی طاقت نے تعویذ کو الٹانے کی کوشش کی لیکن وہ الٹا نہ ہو سکا۔ اس کا اندازہ مجھے اس سے ہوا کہ تعویذ کا ایک کونہ اوپر اٹھتا۔ جیسے کوئی اسے الٹانا چاہتا ہو لیکن الٹنے کی بجائے کونہ پھر زمین پر گر جاتا۔ ادھر میں یہ سب اپنی بند آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور ادھر میرے عزیز اور دوسرے چند افراد اپنی آنکھوں سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

تعویذ الٹانے کی ناکام کوشش کرنے کے چند لمحوں بعد ہی میری نظروں کے

سامنے ایک سایہ ابھرا۔ یہ ایک انسان کی شکل تھی لیکن قدو قامت زیادہ۔ چوڑائی تو اتنی تھی جیسے چار موٹے موٹے آدمی ایک ساتھ کھڑے ہوں۔ اس کا چہرہ میری طرف نہیں تھا۔ سر پر ایک ٹوپی تھی۔ بند آنکھوں کے باوجود میرے سامنے روشنی تھی اور میں اس عجیب و غریب مخلوق کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد سوال و جواب کا طویل دور شروع ہو گیا۔

شاہ صاحب نے جو پوچھنا ہوتا وہ مجھ سے کہتے۔ وہ سایہ اس کا جواب دیتا اور میں اپنی زبان میں شاہ صاحب کو بتا دیتا۔

سب سے پہلا سوال جو شاہ صاحب نے کیا وہ یہ تھا "یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تم کون ہو یعنی جن۔ لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ تم مسلمان ہو یا عیسائی اور دیکھنا خبردار اگر تم نے جھوٹ بولا۔"

دوسری طرف سے اس نے جواب دیا کہ وہ عیسائی ہے۔ پھر ثبوت کے طور پر اس نے اپنے سر سے ٹوپی اتار دی۔ میں نے دیکھا کہ ایک بالوں کی لٹ جو عموماً ہندو رکھتے ہیں لٹک رہی ہے۔ شاہ صاحب نے دوسرا سوال کیا۔ "چھپا کر کے کیوں کھڑے ہو؟ ہمت رکھتے ہو تو سامنے منہ کر کے بات کرو۔"

اس پر وہ کہنے لگا۔ "یہ بات نہیں چہرہ اس لئے سامنے نہیں کر رہا کہ یہ (یعنی میں) ڈر جائے گا لیکن میں اسے ڈرانا نہیں چاہتا۔"

شاہ صاحب۔ "تم کب سے اس کے ساتھ ہو؟"

جن بولا۔ "دو سال سے۔"

شاہ صاحب نے پوچھا۔ "تم نے اسے کیوں پکڑ رکھا ہے؟"

یہاں یہ یاد رہے کہ میں اچھی طرح ہوش میں تھا۔ میرا دل اور دماغ ٹھیک کام کر رہے تھے۔ اس نے کہا۔

"یہ مجھے اچھا لگا تھا۔ اس لئے پکڑ لیا۔"

"کہاں سے پکڑا تھا؟" شاہ صاحب نے پوچھا۔

"کالج کے دروازے کے ساتھ جو درخت ہے۔ میں وہاں تھا۔ یہ کالج میں داخلہ لینے کے لئے آیا۔ جب گیٹ سے گزرا تو مجھے اچھا لگا اور میں نے پکڑ لیا۔"

لیجئے جناب اس طرح اس حادثے کی ابتدا ہوئی۔ یعنی کالج میں داخل ہونے کی سزا مجھے بھگتنا پڑی۔

"تم دو سال اس کے ساتھ رہے۔ تم نے اسے کوئی تکلیف نہ دی۔ حالانکہ تمہاری قوم چاہے کسی پر کتنی ہی مہربان کیوں نہ ہو' کوئی نہ کوئی تکلیف ضرور دیتی ہے۔" شاہ صاحب نے دریافت کیا۔

"مجھے اس سے پیار تھا۔ میں تو اس پر اپنی عنایات کرتا رہا۔ میں بھلا اسے کیونکر تنگ کرتا۔"

شاہ صاحب کہنے لگے کہ اب تمہیں اسے چھوڑنا ہو گا۔ لیکن وہ کہہ رہا تھا کہ آپ کو میری موجودگی پر کیا اعتراض ہے۔ میں نے اسے کیا تکلیف دی ہے جو آپ مجھے بھگانا چاہتے ہیں۔ اس پر ہمارے ایک عزیز بولے کہ اسے کانٹا بنا دیا ہے اور ابھی کہتے ہو کہ کچھ کیا ہی نہیں۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ یہ موٹا ہو جائے گا لیکن ہم نہیں جائیں گے۔

شاہ صاحب نے کہا کہ ہمیں تم سے اپنے ایک دوست کے چند کام کروانے ہیں۔ اس لئے ہم تمہیں ابھی نہیں نکالتے۔ اگلی اتوار کو تم سے نبٹیں گے۔ اس پر کھیل ختم ہو گیا۔ میری آنکھیں کھول دی گئیں۔ تعویز لے لئے گئے اور ایک تعویز مجھے گلے میں ڈالنے کے لئے دے دیا گیا۔ شاہ صاحب نے ایک ہفتہ کی مہلت اس لئے دی تھی کہ ان کے ایک دوست نے کچھ زمین خریدنی تھی اور وہ یہ کام اس جن سے لینا چاہتے تھے لیکن یہی مہلت میرے لئے دہشت اور حادثہ کا سبب بن گئی۔

گھر پہنچ کر سب کو تفصیل بتائی۔ میرا کالج بھی کھلنے والا تھا۔ دوسرے والد صاحب کو بھی پیغام دینا تھا کہ یہ کام ایک ہفتے تک ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اس لئے فیصلہ یہ ہوا کہ میں والد صاحب کے پاس چلا جاؤں اور اگلی اتوار واپس آ جاؤں۔ مجبوراً جانا پڑا۔ چونکہ دوسری صورت میں والد صاحب پریشان ہوتے۔ یقین مجھے اب بھی نہیں تھا کہ مجھ پر کسی جن کا سایہ ہے۔ آپ کہیں گے کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ چونکہ میں ان باتوں پر بالکل یقین نہ رکھتا تھا اس لئے اب بھی اقرار کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ لیکن جب اس تیز روشنی کا خیال

آتا جو میں نے اپنی آنکھوں کے بند ہوتے ہوئے بھی دیکھی تھی تو پھر مجھے اقرار کرنا پڑتا۔ خیر اس کشمکش میں دن کے بارہ بج گئے۔

پہلے تو میرا والد صاحب کے پاس جانے کو جی نہ چاہ رہا تھا۔ لیکن اب یہ حالت تھی کہ میں ہر قیمت پر اور اسی وقت ان کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے دوپہر کے کھانے کی بھی پرواہ نہ کی اور چل پڑا۔ تعویذ جو گلے میں ڈالنے کے لئے دیا گیا تھا' وہ ڈوری کے نہ ہونے کی وجہ سے ڈال نہ سکا اور اسے وہیں بھول آیا۔ طبیعت ہشاش بشاش تھی لیکن سفر کے اختتام پر جونہی میں بس سے اترا' میرا جسم بوجھل ہو گیا۔ سارے جسم میں درد محسوس ہونے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تیز بخار نے آلیا ہو۔ لیکن کیا یہ بخار بس سے اترتے ہی چڑھنا تھا؟ اس کا احساس اس سے پہلے کیوں نہیں ہوا؟ ان باتوں کا جواب میرے پاس نہ تھا۔ بس سٹینڈ سے گھر تک کا فاصلہ طے کرنا ناممکن ہو گیا۔ میری آنکھیں سرخ ہو کر باہر کو نکل آئیں۔ قدم آگے رکھتا لیکن وہ پیچھے کو پڑتا۔ ایک فرلانگ کا فاصلہ بمشکل آدھ گھنٹے میں طے کیا۔ گھر جاتے ہی میں بستر پر لیٹ گیا۔ میرا ایک چھوٹا بھائی اور بہن بھی وہیں تھے۔ میں نے بڑے مزے لے لے کر صبح کے واقعے کی تفصیل بتائی۔ حالانکہ وہ خاصے پریشان تھے۔ شدید قسم کے درد کی وجہ سے میں نماز مغرب تک بستر پر لیٹا رہا۔ ایک عجیب قسم کا احساس مجھے بار بار پریشان کرتا رہا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میرے ساتھ ایک نہایت خطرناک قسم کا حادثہ پیش آنے والا ہے۔ دوسرے مجھے وہ تعویذ یاد آ گیا جسے میں وہیں بھول آیا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اب بھی وقت ہے واپس چلے جاؤ۔ میں نے اس کا اظہار والد صاحب سے بار بار کیا۔ لیکن وہ شاید مجھے تسلی دینے کے لئے کہتے کہ کوئی بات نہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں خوف کھانے کی ضرورت نہیں' لیکن چند گھنٹوں کے بعد ہونے والے واقعات نے ہمارا پتہ پانی کر دیا۔

نماز مغرب کے فوراً" بعد میں کھانے سے فارغ ہو کر ڈرائنگ روم میں اپنے والد کے پاس چلا گیا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ میں بھی بیٹھ گیا اور ان کے قریب رکھی ہوئی رنگین تصاویر والی کتاب دیکھنے لگا۔ چھوٹا بھائی اور بہن باورچی

خانے میں ملازم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں تصویروں پر والد صاحب کے ساتھ تبادلہ خیال کرتا رہا۔ اس ڈرائنگ روم کا ایک دروازہ باہر لان کی طرف کھلتا تھا۔ مجھے اس دروازے سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ حالانکہ میں یہاں عموماً" بیٹھا کرتا تھا۔ میں نے تین چار دفعہ دروازہ بند کیا۔ لیکن والد صاحب پھر کھلوا دیتے کہ ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے۔

رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ بتی جل رہی تھی۔ میں اور والد صاحب اکیلے ڈرائنگ روم میں تھے۔ لان والا دروازہ والد صاحب کے پیچھے تھا اور میرا منہ اسی کی جانب تھا۔ اچانک باتیں کرتے کرتے میری نظر سامنے کی جانب پڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ مجھ سے کوئی دس گز کے فاصلے پر دروازہ کے باہر وہی سایہ جسے میں نے اپنی بند آنکھوں سے دیکھا تھا' کھڑا ہے۔ چہرے پر نقاب' صرف آنکھیں نمایاں۔ سر پر تاج' جس میں سے آنکھوں کو چندھیا دینے والی سفید روشنی نکل رہی تھی۔ روشنی اس قدر تیز اور ٹھنڈی تھی کہ چاند اس کے آگے ماند تھا اور پھر نظروں سے نظریں ملیں۔ میری آنکھیں جامد ہو گئیں۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ اپنی آنکھوں کو اس سے ہٹالوں یا گردن کو ہی موڑ لوں مگر ناکام رہا۔ یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہو گیا۔

جب والد صاحب نے دیکھا کہ میں باتیں کرتے کرتے اچانک چپ ہو گیا ہوں تو انہیں نے نظریں اٹھا کر جو میری طرف دیکھا تو زور سے ایک چیخ ماری۔ انہوں نے دیکھا کہ میرا جسم ساکت ہے آنکھیں سرخ اور باہر کو نکلی ہوئی ہیں اور ایک جگہ مرکوز ہیں۔ آنکھوں کی پتلیاں ایک جگہ جامد ہیں۔ دوسری طرف دیکھنے کے لئے میں پتلیوں کو گھمانے کی بجائے گردن موڑ کر دیکھتا ہوں تو ان کے حلق سے ایک اور چیخ نکلی۔ اس سے پیشتر کہ چیخ سن کر باورچی خانے سے کوئی پہنچتا' وہ خبیث اپنا کام کر چکا تھا۔ وہ میرے جسم میں داخل ہو چکا تھا اور میں اس کی موجودگی محسوس کر رہا تھا۔ والد صاحب کی چیخ سن کر اس نے (یعنی میں' کیونکہ وہ اب مجھ میں تھا) والد صاحب کی طرف گھورا۔ پھر پاؤں سے لے کر آہستہ آہستہ اوپر کی جانب دیکھا۔ جس جس جگہ اس کی نظر پڑتی گئی' والد صاحب کا جسم بے جان ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ نظریں دل تک پہنچ گئیں۔ پھر والد صاحب کی ایک اور چیخ ابھری۔ "اوہ۔ میں مرگیا۔" اور

ساتھ ہی بڑی قوت کے ساتھ انہوں نے میری گردن کو ہاتھوں کے ساتھ پرے دھکیل دیا۔ اتنی دیر میں وہ اپنا کام کر چکا تھا۔ والد صاحب کا جسم دل تک بے جان پڑا تھا۔ وہ پلنگ پر پڑے ہوئے تھے۔ چھوٹے بہن بھائی اور نوکر بھاگ کر ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ والد صاحب کا اصرار تھا کہ میں ان کی طرف نہ دیکھوں۔ لیکن مجھ سے ان کی تکلیف دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ میں نے اپنی نظریں فرش پر مرکوز کر دیں لیکن میرے جسم کا کوئی بھی حصہ اب میرے کنٹرول میں نہیں تھا۔ صرف دماغ میرے بس میں تھا اور وہ صحیح کام کر رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا' سوچ رہا تھا' آئندہ آنے والے واقعات کا تجزیہ کر رہا تھا لیکن جسم کا اور کوئی حصہ میرے بس میں نہیں تھا۔ دل' ہاتھ' پاؤں' غرض ہر حصے پر کسی اور کا قبضہ تھا۔ وہ جن حقیقت میں جنوں کا بادشاہ تھا۔ وہ اب میرے جسم میں تھا لیکن اس کی موجودگی کا احساس مجھے اس وقت ہوتا جب وہ میرے جسم کے ایک حصے سے دوسرے حصے کی طرف حرکت کرتا۔ ایسی صورت میں مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے بجلی کا کرنٹ میرے جسم سے گزر رہا ہو۔ کبھی وہ میری ٹانگوں سے اوپر کی طرف آتا اور کبھی بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کی جانب جاتا۔ پھر اس نے ہم تینوں میں جانا شروع کر دیا۔ کبھی وہ مجھ میں ہوتا کبھی والد صاحب میں اور کبھی میرے بھائی میں۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ صرف بہن اور نوکر اس عذاب سے محفوظ تھے لیکن دہشت سے سب کی زبانیں گنگ تھیں۔

جب وہ میرے بھائی میں موجود تھا تو میں نے جلدی سے نوکر کو کہا۔ "قریب سے کسی مولوی کو بلا لاؤ۔ جلدی آنا۔" دوسروں کو کہا کہ قرآن مجید کی تلاوت کرو۔ خود بھی میں نے قرآن پاک کھول لیا۔ لیکن مجھے پڑھنا نہیں آ رہا تھا۔ حالانکہ میں نے قرآن پاک پڑھا ہوا تھا۔ لیکن اس وقت یہ مجھے کسی اور زبان میں لکھا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ میں صرف کلمے کا ورد کئے جا رہا تھا۔ ادھر شاہ جنات کبھی بائیں دروازے سے کمرے میں داخل ہوتا اور اپنے شکار کو دبوچتا اور کبھی دائیں دروازے سے آتا۔

ہم سب کا برا حال تھا۔ پڑوس کے لوگ ہمارے گرد جمع تھے اور اونچی آواز میں قرآن پاک کی تلاوت اور کلمے کا ورد کر رہے تھے۔ لیکن شاہ جنات کی آمد کا سلسلہ نہ رک سکا۔ اتنی دیر میں مولوی صاحب بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے بھی پڑھ کر پھونکنا

شروع کر دیا لیکن جب وہ مجھ پر پھونکتے تو وہ والد صاحب کے جسم میں داخل ہو جاتا اور میں چیختا۔ "مولوی صاحب اس طرف پھونک مارو۔" لیکن دوسرے ہی لمحے وہ وہاں سے نکل کر مجھ میں آ جاتا۔

اسی حالت میں آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ جو ہمارے لئے قیامت سے کم نہیں تھا۔ آخر والد صاحب نے کہا۔ "مولوی صاحب۔ اس کی آنکھوں پر دم کرو۔"

مولوی صاحب نے جونہی میری آنکھوں پر دم کیا مولوی صاحب بھی اس کا شکار بن گئے۔ ان کے اپنے الفاظ ہیں۔ "میرے کندھوں پر پہلے تو ہزاروں من بوجھ پڑ گیا پھر جسم میں ارتعاش شروع ہوا اور اس کے بعد شاہ جنات کی آمدورفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔"

اب مولوی صاحب نے دو قرآن مجید اٹھا لئے۔ ایک کو سینے سے لگایا اور دوسرے کو سر پر رکھا اور لگے بھاگنے۔ لیکن اس نے انہیں روک لیا۔ اس وقت وہ میرے جسم میں تھا۔ میں نے کہا۔ "مولوی صاحب خدا کے واسطے' رسول کے واسطے یہاں سے مت جائیے ورنہ یہاں دو جانیں تلف ہو جائیں گی۔" لیکن مولوی صاحب کچھ سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ کیونکہ دوسری صورت میں خود ان کو اپنی جان کا خطرہ تھا۔ اتنی دیر میں مجھے محسوس ہوا جیسے اب وہ چلا گیا ہے۔ میں نے والد صاحب کو کہا کہ اب وہ چلا گیا ہے۔ لیکن میرا بھائی اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کہنے لگا۔ "قسم کھا کر کہو کہ تم واقعی چلے گئے ہو۔" اور پھر ایک قیامت خیز دھماکے کی آواز آئی۔ میرے دل میں سے ایک بجلی کی لہر اٹھی اور حلق میں سے گزرتی ہوئی زبان تک آئی اور پھر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میرے جبڑوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر زور سے کھول دیا ہے اور پھر جس طرح قے آتی ہے اور آدمی کا منہ خود بخود کھل جاتا ہے بالکل اسی طرح میرے ساتھ ہوا لیکن قے کی جگہ یہ آواز آئی۔

"قسم حضرت سلیمانؑ کی۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔"

پہلے تو باتیں میرے ذریعے ہوتی رہی تھیں۔ لیکن یہ اس کی اپنی آواز تھی۔ اس قدر تیز کہ دو سو گز دور تک سنی گئی اور وہاں سے لوگ بھاگ کر آ گئے۔ حالانکہ ہم سب ایک کمرے میں تھے۔ اس نے عیسائی ہوتے ہوئے کلمہ پڑھا تھا تاکہ ہمیں

غلط تاثر دے اور مولوی صاحب کو یہ ثابت کرے کہ وہ اس سے زیادہ علم رکھتا ہے۔

میں نے والد صاحب سے کہا کہ ہمیں فوراً" اپنے عزیز کے ہاں چلنا چاہیے تاکہ ہم شاہ صاحب سے مل سکیں ورنہ ہم سب یہیں ختم ہو جائیں گے۔ چنانچہ ہم سب روانہ ہوئے۔ جب ہم بازار سے گزر رہے تھے تو ہر شخص حیرت سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ ہر شخص خوفزدہ دکھائی دیتا تھا۔ چنانچہ اونچی آواز میں کلمے کا ورد کرتے ہم بس سٹینڈ پر پہنچ گئے۔ دس منٹ بعد ہی بس آ گئی۔

وہاں پہنچے تو ابھی ایک قدم زمین پر لگا تھا کہ شاہ جنات آ گیا۔ ہم سب نے پھر اونچی آواز میں کلمے کا ورد شروع کر دیا۔ میرا جسم تن گیا اور وہ مخاطب ہوا۔ "تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم شاہ جنات کے برابر چل رہے ہو۔ میرے پیچھے چلو۔ تمہیں شاہی آداب کی بھی تمیز نہیں۔" ہم سب پیچھے ہو گئے۔ میں آگے آگے چل پڑا۔

گیارہ بجے رات یہ قافلہ گھر کے دروازے پر پہنچا۔ میں نے لگاتار زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہماری ایک رشتہ دار خاتون نے دروازہ کھولا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ مجھ سے اس وقت آنے کا سبب پوچھتی۔ میں نے کہا۔ "مائی کلمہ پڑھو۔" اور اس کے ساتھ ہی اس پر بھی وحشت چھا گئی۔

ہم سب اونچی آواز میں کلمہ پڑھتے ہوئے صحن میں چلے گئے۔ یہاں پھر کہرام مچ گیا۔ گھر والوں نے سمجھا کہ ہم سب پاگل ہو گئے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ مجھ سے پوچھتے کہ کیا ہوا ہے تو وہ مجھ میں آ جاتا اور کہتا۔ "میری وجہ سے ہوا ہے۔"

یہاں بھی پڑوس کے لوگ جمع ہو گئے۔ میں اندر کمرے میں چلا گیا۔ اس وقت بھی میرا جسم کنٹرول میں نہیں تھا۔ اچانک میرے ہاتھ اوپر اٹھے اور میں نے کہا۔ "خاموش۔ خاموش خبردار اگر کسی کی آواز آئی۔ صرف کلمہ پڑھو۔"

بعد میں مجھے بتایا گیا کہ ایک خاتون نے مجھ سے پوچھا تھا کہ آخر تمہیں ہوا کیا ہے؟ میں نے اسے جواب دیا تھا۔ "جانتی نہیں کس سے ہم کلام ہو۔ تمہیں شاہی آداب سے بھی واقفیت نہیں۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔"

چونکہ میں نے ان لرزہ خیز باتوں اور واقعات کو بھلانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور دوسرے یہ کہ میں اس وقت خود ہوش میں نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ میرا دماغ صحیح کام کر رہا تھا۔ اس لئے میں بعض باتیں بھول چکا ہوں اور بعض اب بھی وحشت کے مارے نہیں لکھ رہا۔ دوسروں سے اس لئے نہیں پوچھنا چاہتا کہ اس کی یاد تازہ نہ ہو۔ بہرحال مجھے اتنا معلوم ہے کہ میں پھر کرسی پر بیٹھ گیا اور معلوم نہیں، کسے حکم دیا کہ شاہ صاحب کو بلا کر لاؤ۔

کوئی پانچ منٹ بعد ہی شاہ صاحب پہنچ گئے۔ ہمارا کلمے کا ورد جاری تھا کہ شاہ صاحب پہنچ گئے۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ یکدم مجھ میں ایک قوت سی آ گئی اور میں بھاگ کر دروازے کی طرف گیا۔ دروازہ خود کھولا۔ شاہ صاحب سامنے تھے۔ سب سے پہلی بات جو ان سے ہوئی وہ یہی تھی۔ "کلمہ پڑھو۔" لیکن شاہ صاحب نے مجھے گریبان سے پکڑ لیا اور کہا۔ "کلمہ تمہیں میں پڑھاتا ہوں۔"

ان کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ وہ یکدم بدل گیا اور کہنے لگا۔ "آؤ شاہ صاحب گلے ملیں۔"

اور ہم گلے ملے۔ یہ یقین رہے کہ یہ سب کچھ میں نہیں کر رہا تھا بلکہ وہی خبیث چیز شاہ جنات تھی۔ ورنہ میرے ساتھ جو کچھ بیت رہی تھی، اس سے تو میں دہشت کے مارے مر جاتا۔ شاہ صاحب نے ہمیں بعد میں بتایا اگر وہ شخص جو ابھی بلانے کے لئے گیا تھا، یہ نہ بتاتا کہ یہ سب کچھ کس وجہ سے ہوا ہے اور وہ اپنے گھر وغیرہ کو کیل کر نہ آتے تو ان کا بھی وہی حشر ہوتا جو مولوی صاحب کا ہوا۔ یہ تو خدا تعالیٰ نے نہایت کرم اور بخشش کی تھی کہ اس نے ہم گنہگاروں کو بخش دیا اور شاہ صاحب کے ذریعے ہمیں اس مصیبت سے نکالا ورنہ ہماری بربادی میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی۔

خیر پھر وہی سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔ شاہ صاحب نے کہا کہ خبردار! جو کوئی حرکت کی۔ تم یا تمہارے ساتھ اگر کوئی اور بھی ہے تو وہ سب اس میں (یعنی مجھ میں) آ جائے۔

حکم کی تعمیل ہوئی۔ مجھے پھر اسی طرح تعویذ پکڑا کر آنکھیں بند کر کے بٹھا دیا گیا

اور پھر مکالموں کا وسیع سلسلہ شروع ہوا جو رات گیارہ بجے سے صبح ساڑھے تین بجے تک جاری رہا۔ مکالمے ہو بہو وہی ہیں۔

شاہ صاحب نے کہا۔ "تم کون ہو؟"

وہ بولا۔ "میں شاہ جنات ہوں۔"

شاہ صاحب نے پوچھا۔ "کس قبیلے کے سردار ہو؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ میں پورے پرستان کا مالک شاہ جنات ہوں۔ میں سردار نہیں' شاہ جنات ہوں۔ شاہ جنات۔ جنوں کا بادشاہ۔"

"کیا تم وہی ہو جس کو کہا گیا تھا کہ تمہیں اتوار کو نکالیں گے یا تم کوئی اور ہو۔"

"نہیں۔ میں وہی ہوں۔"

"تو تم نے وعدہ خلافی کیوں کی؟"

"ہم نے وعدہ ہی کب کیا تھا۔"

"تم نے اسے تنگ کیوں کیا؟"

"انہوں نے مجھے ظاہر کیوں کیا۔ میں نے انہیں کیا تکلیف دی تھی جو یہ مجھے نکالنے پر تل گئے۔"

"تم تو عیسائی تھے۔ تم نے اپنی ناپاک زبان سے ہمارا کلمہ مقدس کیوں پڑھا؟"

"یہ تاثر دینے کے لئے کہ میں بھی مسلمان ہوں اور ایک بڑا عالم ہوں۔ تاکہ مجھے کوئی نکالنے کی جرات نہ کر سکے۔"

"دوسرے لوگوں کا کیا قصور تھا کہ تو نے انہیں ڈرایا۔ اگر کوئی دہشت سے مر جاتا تو پھر؟"

"یہی تو میں چاہتا تھا اور اگر آپ کو دس منٹ دیر ہو جاتی تو یہاں چار لاشیں تڑپتی ہوئی ملتیں۔"

"کس کس کی؟"

"رفیع' اس کے ابا' اس کے بھائی اور بہن کی۔"

اس پر شاہ صاحب کا لہجہ سخت ہو گیا۔ انہوں نے اپنے سامنے رکھے ہوئے

تعویز کو دبانا شروع کر دیا۔ اف میرے اللہ تعویز کا دبانا تھا کہ شاہ جنات کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ چیخا۔ "اوہ۔ تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ اس تعویز کو مت دباؤ۔ خدا کے لئے ایسا نہ کرو۔ حضرت سلیمانؑ کی قسم میں چلا جاتا ہوں۔ قسم حضرت سلیمانؑ کی۔ میں پھر کبھی نہیں آؤں گا۔ لیکن اس تعویز کو مت دباؤ۔ میری جان نکلی جا رہی ہے۔"

دوسرے ہی لمحے شاہ صاحب نے پھر تعویز کو دبایا۔ وہ پھر چیخا۔ "اوہ میرے جوڑ ٹوٹ گئے۔ میری ہڈیاں چٹخ گئی ہیں۔ خدا کے واسطے مجھے چھوڑ دو۔ میں پھر کبھی نہیں آؤں گا۔"

لیکن شاہ صاحب اب کہہ رہے تھے۔ "میں تو تمہیں اسی میں رکھوں گا۔ میں تمہیں اب نہیں جانے دوں گا۔"

شاہ صاحب کا پانسہ بھاری تھا۔ شاہ جنات کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ جب وہ چیخا تو دیکھنے والے کہتے ہیں کہ میرا چہرہ ہی بدل جاتا۔ عجیب قسم کا رنگ ہو جاتا۔ یہاں تک کہ جو قریب بیٹھے ہوئے تھے انہیں بھی خوف محسوس ہونے لگتا۔ پہلے تو اس نے ہر قسم کا لالچ دیا کہ "میں تمام دنیا اور پرستان کے خزانے کھول دیتا ہوں تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو میں وہ مہیا کرتا ہوں۔ چند گھنٹوں میں تمہیں دنیا کا عظیم ترین آدم زاد بنا دوں گا لیکن خدا کے لئے مجھے اس سے جدا نہ کرو۔"

لیکن شاہ صاحب کے کلام کا اثر تھا کہ اب وہ منتیں کرتا تھا کہ خدا کے لئے مجھے جانے دو۔ میں پھر کبھی نہ آؤں گا لیکن شاہ صاحب کہہ رہے تھے۔

"نہیں۔ میں نے تو تمہیں رکھنا ہی اسی میں ہے۔"

مختصر یہ کہ میرے ہاتھ میں پین پکڑا دیا گیا اور کاغذ میرے آگے رکھ دیا گیا۔ آنکھیں میری بند تھیں اور مجھے کہا گیا کہ یہاں تحریری طور پر اس بات کا اقرار کرو کہ تم یا تمہاری قوم میں سے اب کوئی شخص اس پر حملہ نہیں کرے گا۔ چنانچہ اچانک میرے دائیں ہاتھ میں ایک برقی رو دوڑتی ہوئی آئی اور میرا ہاتھ فوراً" لکھنے لگا۔

"میں حضرت سلیمانؑ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں یا میری قوم کا کوئی فرد اس

کو یا اس کے علوید ان کو کوئی تکلیف نہیں دے گا۔"

یہ بات اس نے تین بار لکھی۔ یہ کاغذ شاہ صاحب نے اپنے پاس محفوظ کر لیا اور اسے حکم دیا کہ وہ میرے دائیں ہاتھ میں آ جائے۔ پھر مجھ سے پوچھا۔ میں نے اقرار کیا کہ واقعی وہ میرے دائیں ہاتھ والے تعویز میں ہے۔ اس پر شاہ صاحب نے مجھے ایک تعویز دیا اور کہا کہ اسے آنکھوں پر پھیر کر آنکھیں کھول لو۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ دائیں ہاتھ والا تعویز اب میرے ہاتھ میں تھا اور آنکھیں کھلی تھیں۔ شاہ صاحب نے اس تعویز کو کھول کر پھر مجھے پکڑا دیا اور کہا۔ "اس میں دیکھو کہ کچھ ہے؟"

میں نے دیکھا۔ شاہ جنات تعویز کے اعداد والے خانوں میں سے ایک میں ہے۔ شاہ صاحب نے اسی وقت ماچس نکالی اور تعویز کو آگ لگا دی۔

جونہی تعویز کے ساتھ وہ جلا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرے جسم سے جان نکل رہی ہو اور پھر میں بیہوش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہوش آیا تو میں اپنے عزیزوں میں گھرا ہوا تھا۔ لیکن اب ہم سب بخیریت تھے۔ شاہ صاحب میرے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ میرا جسم بالکل ٹھیک ٹھاک تھا جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

☆☆☆

جادوگر

میں ٹرین میں بیٹھا ایک دوردراز شہر جا رہا تھا۔ سیکنڈ کلاس کا مختصر سا کمپارٹمنٹ تھا جس میں اس وقت میرے سوا اور کوئی مسافر نہیں تھا۔ شام کا وقت تھا۔ گردوغبار اور خنک ہواؤں سے بچنے کے لئے میں نے کمپارٹمنٹ کی ہر چھوٹی بڑی کھڑکی کو بند کر رکھا تھا۔ ایک برتھ پر بستر بچھائے لحاف اوڑھے بڑے آرام سے لیٹ کر اپنے مقصد سفر پر غور کر رہا تھا۔

ٹرین ایک سٹیشن پر رکی اور کسی نے دروازہ پر دستک دی تو مجھے گرم گرم بستر سے نکلنا بہت ناگوار گزرا۔ اندر ہی سے گرج کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔ مجھے بڑا غصہ آیا میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ایک داڑھی والا شخص ایک ہاتھ میں عصا اور دوسرے ہاتھ میں بیگ لئے بغیر کوئی بات کہے اندر گھس آیا۔ میں نے دیکھا۔ اس کے لباس سے ایک شان ٹپک رہی تھی۔ چہرے پر ایک رعب نمایاں تھا۔ اس نے ایک نظر بھر کر مجھے دیکھا اور ایک سائیڈ ونڈو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کھول دو۔"

میں نے لپک کر ونڈو سکرین اٹھا دیا۔ نجانے وہ شخص کیوں مجھے اتنا پسند آیا کہ غصے کے تمام جذبات فوراً ماند پڑ گئے اور اس کی جگہ خواہش پیدا ہو گئی کہ میں اس شخص کی تواضع کروں۔ بڑا اچھا ہوا کہ سفر میں ساتھی مل گیا ہے۔ ونڈو کھول کر میں نے بستر کو جلدی سے استوار کیا اور بڑے مودبانہ انداز میں کہا۔

"تشریف رکھئے۔"

بڑے سکون کے ساتھ وہ بستر میں گھس گیا۔ بالکل اس طرح جیسے یہ اس کا اپنا بستر ہے اور اسے حق حاصل ہے کہ وہ جس طرح جی چاہے اسے استعمال کرے۔ اس نے بوٹ تو اتار دیئے مگر جرابیں اتارنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اپنا مختصر سا بیگ اور عصا اس نے پہلے ہی لاپروائی سے ایک طرف ڈال دیا تھا۔ مجھے اپنی حالت

کا احساس نہیں تھا۔ میں اس وقت صرف یہ سوچ رہا تھا کہ اس شخص کو کس طرح زیادہ سے زیادہ سکون پہنچایا جا سکتا ہے۔ ایک اخبار فروش لڑکا چند سیکنڈ کے لئے کھڑکی کے سامنے ٹھہرا اور عجیب سی آواز گلے سے نکالی۔ "اخبار رسالے۔"

اس کی نظر داڑھی والے شخص پر پڑی۔ داڑھی والے شخص نے اسے دیکھا اور اخبار فروش لڑکا آپ ہی آپ کمپارٹمنٹ کے اندر آ گیا۔ اس نے اخبارات کا بنڈل اس شخص کے سامنے کر دیا۔ اس نے رسالوں میں سے ایک ماہنامہ نکالا اور اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اخبار والے لڑکے نے دو تین رسالے اور اٹھا کر اس کے پاس رکھ دیئے اور کہا "یہ بھی رکھئے۔ سفر آرام سے کٹ جائے گا۔"

اس شخص نے جواب میں "بس یہی کافی ہے۔" قسم کا اشارہ کیا مگر لڑکا بغیر رسالے اٹھائے باہر جانے لگا۔ میں نے اسے روکا اور ان رسالوں کی قیمت ادا کرنا چاہی مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا اور باہر نکل گیا۔ میں سامنے کی برتھ پر بیٹھ گیا اور چند منٹ ایک اضطرابی کیفیت میں اس شخص کو دیکھتا رہا۔ وہ شخص بڑے شاہانہ انداز میں رسالے کی ورق گردانی کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد ایک ایس ٹی دروازے پر نمودار ہوا اور کمپارٹمنٹ کا معائنہ کرتے ہوئے اندر آ گیا۔ اس نے اس باریش شخص سے غالباً" ٹکٹ کے بارے میں کچھ کہنا چاہا مگر اسے دیکھ کر سٹپٹا سا گیا۔ وہ الفاظ کی ترتیب قائم نہ رکھ سکا۔ عجیب بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ "ٹکٹ۔ جی وہ۔ میرا مطلب ہے۔ بات یہ ہے۔ خیر آپ آرام فرمایئے میں چلتا ہوں۔" شاید وہ اپنے خیال میں آپ ہی الجھ گیا تھا۔ اس سے بات ادا نہ ہو سکی اور وہ اتنی جلدی باہر نکل گیا جیسے اس نے اندر آ کر بڑی غلطی کی ہو۔

میں یونہی نیازمند سا بن کر برتھ پر بیٹھا تھا کہ اس شخص نے مجھے حکم دیا۔ "دروازہ بند کر دو۔"

میں نے فوراً" تعمیل کر دی۔ اس نے بیٹھ جانے کا حکم دیا تو میں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر وہ رسالوں کی ورق گردانی کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے انہیں یوں ایک طرف ڈال دیا جیسے کہہ رہا ہو "پسند نہیں۔" پھر مجھ سے بولا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

میں نے جلدی سے جواب دیا۔ "جمیل خاکوانی صاحب" لفظ صاحب میں اس

کی عزت کے اظہار کے طور پر کہنا چاہتا تھا مگر بات اس طرح منہ سے نکلی جیسے خود کو "صاحب" کہہ دیا ہو۔ دراصل میں بھی کچھ بوکھلا سا گیا تھا۔ اس نے کہا۔

"تم نے میرا نام نہیں پوچھا؟"

"اب پوچھتا ہوں سر۔ آپ کا اسم گرامی کیا ہے؟"

ٹرین آہستہ آہستہ چل پڑی تھی جب اس نے جواب دیا۔ "پرندوں کی دنیا میں مجھے شاہین کہتے ہیں' درندوں کی دنیا میں میرا نام شیر ہے اور انسانوں کی دنیا کا میں شہنشاہ ہوں۔"

اور مجھے سو فیصد یقین ہو گیا کہ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے سچ کہہ رہا ہے میں نے تھرماس نکالا اور چائے کا ایک کپ بھر کر اسے پیش کیا۔ ساتھ ہی کچھ فروٹ اور سویٹس جو رات کی چائے کے لئے رکھے تھے حاضر کر دیئے۔ وہ بے تکلف ہو کر انہیں کھانے لگا۔ ٹرین چلتی رہی اور میں اس کی ہر ممکن خاطر مدارت کرتا رہا۔ ایک اسٹیشن آیا اور گزر گیا' دوسرے اسٹیشن پر جب ٹرین رکی تو اس نے بوٹ پہنے' عصا اور بیگ سنبھالا اور ازراہ مہربانی مجھ سے ہاتھ ملا کر نیچے اتر گیا۔ وہ اپنے رسائل وہیں چھوڑ گیا جیسے یہ اس کے تھے ہی نہیں۔

جب وہ پلیٹ فارم کی بھیڑ میں گم ہو گیا تو مجھے یوں لگا جیسے میں ایک نیند سے بیدار ہو رہا ہوں۔ ذہن نے آہستہ آہستہ واپس اپنی دنیا میں پلٹنا شروع کیا اور جب میں اپنے ہوش میں آیا تو مجھے پتہ چلا کہ میں اب تک ہپناٹائز رہا ہوں۔

تیزی سے میں نے اس سٹیشن کے واقعات سوچنا شروع کئے جہاں سے وہ پراسرار شخص سوار ہوا تھا۔ اس کا کمپارٹمنٹ کے اندر آنے کا انداز' ایس ٹی کی بوکھلاہٹ اور اخبار فروش لڑکے کی فیاضی --- واضح دلیلیں تھیں کہ وہ ایک ماہر مسمریزم تھا۔ میں نے سوچا وہ اخبار فروش بھی ہپناٹائز ہو کر اسے رسالے دے گیا تھا اور ہپناٹزم ہی کے اثر کے تحت وہ ایس ٹی بوکھلا کر بغیر چیکنگ کے واپس چلا گیا تھا۔ اتنا کچھ سوچنے کے بعد میں فوراً" اٹھا ایک قلی کو بلایا اور جلدی جلدی اسے صرف اتنا کہا۔

"یہ سامان پیک کر کے نیچے اتار لو اور اسے اپنے کنٹرول میں رکھو۔ تمہارا نام

اور نمبر؟"

"جی کرم دین نمبر انیس۔"

میں نے صرف اپنا بریف کیس لیا اور گرتا پڑتا سٹیشن کے انٹرنس کے پاس پہنچ گیا۔ فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے انٹرنس پر مجھے وہ دکھائی نہ دیا تو میں تھرڈ کلاس کے گیٹ پر جا پہنچا۔ وہاں باہر جانے والے لوگوں کی قطار لگی تھی۔ اس قطار میں بھی وہ مجھے نظر نہ آیا۔ جلدی جلدی اسے پلیٹ فارم پر لگی بھیڑ میں ڈھونڈا۔ وہ وہاں بھی نہ ملا۔

مجھے بہت افسوس ہوا بڑی مدت کے بعد ایک آدمی ہاتھ لگا تھا وہ بھی گیا۔ مصیبت یہ تھی کہ میں خود پریشان تھا اور صحیح طور پر ذہن سے کام لینے کے قابل نہ تھا۔ میں جلدی سے پلیٹ فارم سے باہر نکل آیا۔ اچانک میں نے اسے ایک ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ ٹیکسی حرکت میں آ چکی تھی۔ اس کے پیچھے خالی ٹیکسیوں کی ایک لائن کھڑی تھی میں تقریباً" بھاگ کر دوسری ٹیکسی کے پاس پہنچا اور اس کا دروازہ کھول کر دھم سے اندر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور سے کہا۔

"جلدی چلو۔ ابھی جو ٹیکسی تمہارے آگے گیٹ سے باہر نکل گئی ہے اسے اوور ٹیک کرو۔" غالباً" میری گھبراہٹ وہ ٹیکسی ڈرائیور بھی بھانپ گیا۔ کہنے لگا۔

"کیا بات کرتے ہو صاب ہم سے تیز تو پستول بھی نہیں چلتے ہے۔"

وہ واقعی پستول ثابت ہوا۔ ٹیکسی سٹارٹ کی اور گولی کی سی تیزی سے چل دیا۔ ٹیکسی' سٹینڈ کے گیٹ سے باہر نکلی تو سڑک پر اور بہت سی ٹیکسیوں کو آتے جاتے دیکھا۔ اب یہ پہچاننا مشکل تھا کہ ہماری مطلوبہ ٹیکسی کون سی ہے؟ ایک ٹیکسی کو ایک بڑے چوک پر ایک طرف مڑتے پا کر محض قیاس کرتے ہوئے میں نے اس کی طرف اشارہ کر دیا اور ڈرائیور اسی طرف گھوم گیا۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"سٹیشن پر جو ٹیکسی تمہارے آگے کھڑی تھی' کیا تم اس کا نمبر بتا سکتے ہو؟"

اس نے جواب دیا۔ "نمبر تو خیر میں اپنا بھی نہیں بتا سکتا صاب کیونکہ میں ان پڑھ ہوں البتہ ڈرائیور بتا سکتا تھا۔ لیکن بات یہ ہے کہ میں نے اس پر غور ہی نہیں

کیا تھا کہ میرے آگے کون کھڑا ہے اور پیچھے کون۔"

ایک کراس روڈ عبور کرنے کے بعد میرے ٹیکسی ڈرائیور نے اس اگلی ٹیکسی کو جا لیا مگر جب میں نے اس ٹیکسی کے اندر دیکھا تو بڑا افسوس ہوا کہ وہ کوئی اور شخص تھا جس نے اپنے پاس پچھلی سیٹ پر ایک چھوٹی سی بکری بھی کھڑی کر رکھی تھی۔ غصے سے میں نے ہاتھ جھٹک دیا۔ "بیڑا غرق' یہ وہ نہیں' غلط راستے پر آ گئے۔ واپس پلٹو ڈرائیور۔ شاید وہ دوسری سڑک پر گیا ہے۔"

ڈرائیور نے ٹیکسی کی رفتار کم کر دی اور موڑ کاٹنے کے لئے سگنل دیتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"ایک بات پوچھوں صاب۔ کیا کوئی شخص آپ کی بکری لے کر بھاگ گیا ہے؟"

"تمیز سے ڈرائیور۔" میں نے اسے جھڑک دیا اور وہ جھینپ سا گیا۔ ہمیں موڑ کاٹنے کے لئے راستہ نہیں مل رہا تھا۔ چند منٹ انتظار میں کھڑے رہے' ڈرائیور ہارن پر ہارن دیئے جا رہا تھا لیکن پاس سے گزرنے والی گاڑیوں کی قطار میں خلا نہیں پیدا ہو رہا تھا۔ میرا ایک ایک سیکنڈ قیمتی تھا۔ اچانک ایک ٹیکسی ہمارے پاس سے گزر گئی اور میں اس میں بیٹھے ہوئے شخص کو پہچان کر اچھل پڑا۔ وہ میرا وہی پراسرار ہم سفر تھا۔ میں نے خوشی سے ڈرائیور کے کندھے پر ہاتھ مار دیا۔

"یہ ہے وہ ٹیکسی۔"

ڈرائیور نے پہلے تو میری طرف گھور گھور کر دیکھا' پھر آہستہ سے مسکرا کر کہا۔ "یہ ٹیکسی نہیں ہے صاب۔ میرا کندھا ہے۔"

"خیر کچھ بھی ہے۔ آگے بڑھو۔ اسے جانے مت دو۔"

اور ڈرائیور نے اپنی ٹیکسی اس کے پیچھے لگا لی۔ سڑک پر اور بھی بہت سی گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ میں نے کہا۔

"رش میں ٹیکسی اس کے ساتھ لگائے رکھو۔ جب نسبتاً" کم ٹریفک والی سڑک پر پہنچ جاؤ تو فاصلہ بڑھا لینا۔ کیا تم اس ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے آدمی کو پہچانتے ہو؟"

"صرف اتنا پہچانتا ہوں کہ وہ ۔ ایک آدمی ہے۔"

میں مسکرا دیا۔ "تم خاصے زندہ دل آدمی ہو۔ میں مذاق پسند کرتا ہوں مگر صرف اسی وقت جب۔"

ڈرائیور نے میرے منہ سے بات چھین لی۔ "بیڑا غرق نہ ہو رہا ہو۔" اور میں ہنس دیا۔

اگلی ٹیکسی مزید دو چار موڑ مڑنے کے بعد ایک ایسی کھلی سڑک پر آ گئی جس پر چلنے والی گاڑیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ میں نے ڈرائیور کو فاصلہ بڑھا دینے کے لئے کہا۔ کچھ اور آگے چل کر ایک صاف ستھرا علاقہ شروع ہو گیا۔ مکانات کی ترتیب بڑے سلجھے ہوئے انداز میں تھی۔ ہر دو قطاروں کے درمیان گھاس کے چھوٹے چھوٹے خوشنما پارک بنے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں ان میں ٹولیوں کی شکل میں بچے مل کر کھیل رہے تھے۔ اگلی ٹیکسی کوئی دو فرلانگ چلنے کے بعد ایک چھوٹے سے خوبصورت مکان کے سامنے جا کر رک گئی۔ میں نے اپنی ٹیکسی بڑی سڑک سے مڑتے ہی رکوا لی اور اس کے اندر بیٹھے بیٹھے اپنے ہمسفر کی اگلی حرکت کا انتظار کرنے لگا۔

وہ ٹیکسی سے اترا اور مکان کے اندر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد جب اگلی ٹیکسی متحرک ہو گئی تو میں ٹیکسی سے اتر کر پیدل چلتا ہوا اس مکان کے پاس پہنچ گیا۔ اسے غور سے دیکھا نیم پلیٹ پر پروفیسر دلاور کا مختصر سا نام تحریر تھا۔ اردگرد کے دوسرے مکانات کا جائزہ لیتا ہوا میں واپس اپنی ٹیکسی کے پاس آ پہنچا اور اندر بیٹھ کر ڈرائیور سے کہا۔ "واپس ریلوے سٹیشن۔"

ڈرائیور مجھے چند منٹ کے اندر اندر ریلوے سٹیشن لے آیا۔ قلی نے میرا سامان جمع نہیں کرایا تھا۔ وہ ایک بنچ پر سامان رکھے میرا انتظار کر رہا تھا۔ ڈرائیور اور قلی نے مل کر سامان ٹیکسی میں رکھا اور میں ایک ہوٹل میں آ گیا۔

میں نے وہ رات ہوٹل میں گزاری، کچھ سو کر اور کچھ یہ سوچتے ہوئے کہ اب آگے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ایک عرصہ تک میں جس شخص کو تلاش کرتا رہا تھا اب میرے سامنے تھا۔ ایک امید بار آور ہو سکتی تھی، ایک خواب تعبیر میں ڈھل سکتا تھا، مگر کس طرح؟

ہوٹل میں آتے ہی ٹرنک کال کر کے میں نے اپنے طویل سفر کے مقصد کی ذمہ داری ایک شخص کے سپرد کر دی اور ایک کمرہ لے کر اس میں نہا دھو کر چائے پینے کے بعد تازہ دم ہو کر کوئی مناسب حل تلاش کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔

اگلی صبح میں ناشتہ کر کے اسی علاقے کی طرف چل دیا۔ ٹیکسی بڑی سڑک پر ہی چھوڑ دی اور خود پیدل ان مکانوں کا رخ کیا جن میں پروفیسر دلاور کا مکان بھی شامل تھا۔ اس کے مکان کے سامنے گھاس کا ایک پلاٹ تھا۔ اس کی دوسری طرف والی سڑک پر آ کر میں رک گیا اور یونہی اس مکان کو دیکھنے لگ گیا۔

آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ہوں گے جب ایک جوان لڑکی ہاتھوں میں کتابیں سنبھالے مکان سے نکلی اور سڑک پر ہو لی۔ بڑی سڑک پر جا کر وہ مکانات کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔ میں وہاں کافی دیر کھڑا رہا۔ میرے عقب میں ایک کمرے میں دو نوجوان لڑکے کافی دیر سے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ باہر نکلے اور میرے پاس آ کر پوچھا۔

"آپ کو کسی سے ملنا ہے؟"

میں نے انکار کیا تو پوچھا۔ "آپ کب سے سامنے والے مکان کو دیکھ رہے ہیں، کوئی خاص بات ہے کیا؟"

میں کچھ گھبرا سا گیا۔ "کوئی خاص بات نہیں۔ مجھے کرایہ پر ایک مکان کی ضرورت ہے۔"

"تو وہ مکان وہ نہیں۔ اس طرف، آپ کے پیچھے ہے۔"

گھوم کر جو دیکھا تو ایک مکان پر TOLET کی تختی لٹکتی نظر آئی۔ میں نے اس سے کیا تو بہانا تھا مگر TOLET کی تختی دیکھ کر اس بہانے کو حقیقت میں بدل دینے کا خیال پیدا ہو گیا۔ یہ مکان میرے مقصد میں مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔

دوسرے دن کی شام آئی تو میں اس مکان میں ایک کرایہ دار کی حیثیت سے سیٹ ہو چکا تھا۔ مختصر سا فرنیچر مکان میں پہلے سے موجود تھا اور اس سے زائد کی مجھے ضرورت ہی نہ تھی۔ پندرہ سولہ دن میں اس مکان میں رہ کر پروفیسر دلاور کی نقل و حرکت کا مطالعہ کرتا رہا، اردگرد کے ماحول کو سمجھتا رہا اور ایک مناسب حل کے

بارے میں سوچتا رہا۔ کئی بار دل چاہا کہ سیدھا جاؤں' اسے باہر بلاؤں اور اس سے درخواست کروں کہ ازراہ احسان میری مدد کرے ---۔ مگر پھر خیال آتا' ناممکن ہے کہ وہ میری بات مان جائے۔ آخر وہ ایک قوت کا مالک ہے اور جانتا ہے کہ یہ اتنی سستی نہیں کہ ہر خاص و عام کو فیضیاب کرتا پھرے۔ ایک دوسرا خیال جو میرے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ میں تحفے تحائف کا راستہ اختیار کروں مگر یہ بات بھی دل کو لگتی نہیں تھی۔ مشکل تھا کہ وہ اس طریقہ سے بھی زیر دام آ سکے۔ ہو سکتا ہے وہ روپے پیسے کی پیشکش کا غلط مطلب لے لے اور برا مان جائے۔ یا ممکن ہے وہ میری پیشکش اپنی قوت کا کرشمہ سمجھ لے اور میں "بات بھی کھوؤں التجا کر کے" کا نمونہ بن جاؤں۔

پروفیسر دلاور صبح سویرے مکان سے نکلتا نظر آتا اور رات گئے واپس لوٹتا۔ اگر کسی دن وہ واپس نہ بھی آ سکتا تو دوسرے دن رات ہونے سے پہلے واپس آ جاتا۔ طالب علم لڑکی صبح ساڑھے آٹھ بجے گھر سے نکلتی اور سکول یا کالج کے بند ہونے پر گھر آ جاتی۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی شخص مکان کے اندر جاتا آتا نظر نہ آیا۔ ایک دو بار تعاقب کر کے میں نے پروفیسر دلاور کی مصروفیات کا پتہ چلانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ بعض اوقات وہ کسی شاندار سے مکان میں داخل ہوتا تو گھنٹوں بعد باہر نکل آتا۔ خدشہ تھا کہ میں اس کے نوٹس میں آ گیا تو بات بگڑ جائے گی۔ ایک دن ایک بچے سے میں نے اس کے مکان کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہیں مگر وہ اتنا چھوٹا تھا کہ کچھ بھی نہ سمجھا سکا۔ صرف یہ پتہ چل سکا کہ طالب علم لڑکی پروفیسر دلاور کی لڑکی ہے اس کا نام پروین ہے اور اس کی ایک ماں بھی ہے۔ اس سے زائد معلومات بڑی کوشش کے باوجود بھی میں کہیں سے حاصل نہ کر سکا۔ کاش مجھے کوئی ایسا شخص مل جاتا' پروفیسر دلاور جس کی ہر بات ماننے پر مجبور ہوتا۔ کاش پروفیسر دلاور کی زندگی میں کوئی مسئلہ' کوئی الجھن ہوتی اور اسے سلجھانا میرے بس کی بات ہوتی۔ ایسی ہی سوچوں کے درمیان اچانک ایک خیال ذہن میں چمک اٹھا مگر یہ اتنا مضحکہ خیز تھا کہ اس پر عمل کرنے کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی مجھے ہنسی آ گئی لیکن اس کے بغیر کوئی دیگر صورت نظر ہی نہیں آتی تھی۔ ایک موہوم سا

یقین پیدا ہوا تھا کہ اگر اس پر سوچ سمجھ کر عمل کروں تو ہو سکتا ہے کہ کامیاب ہو جاؤں۔ اپنے اس خیال کی اونچ نیچ سوچنے میں میرے گھنٹے صرف ہو گئے۔ بڑی دیر کے بعد آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس خیال کو عملی جامہ پہناؤں گا۔ اس کے علاوہ اور کوئی تدبیر سوجھ ہی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ اس کے ہر پہلو پر سوچنے کے بعد میں نے اپنے دوستوں کا تصور ہی میں جائزہ لینا شروع کر دیا۔ مجھے ایک ایسے دوست کی ضرورت تھی جو اس پیچیدہ اور بھونڈے منصوبے میں میرا مددگار بن سکے۔ ایک کے بعد ایک دوست کی صورت میری نظروں میں آتی گئی اور ہٹتی گئی اور جب ایک نام ذہن پر ابھرا تو خیالات کا سلسلہ ٹھہر سا گیا۔

"جہانگیر مہدی۔"

یہ میرا ایک ایسا دوست تھا جو میرے ہر جائز و ناجائز عمل میں میرے ساتھ تعاون کر سکتا تھا۔ آزاد خیال' لاپروا' انجام سے بے خبر ہو کر کام کرنے کا عادی' مجھے ہر طرح اس کردار کے لئے فٹ نظر آیا۔ وہ ان دنوں زرعی یونیورسٹی میں بی ایس سی فائنل کا سٹوڈنٹ تھا۔ میں نے ضروری تیاری کی اور اس کے شہر کی راہ لی۔ شام ہو گئی تھی' پرندے آشیانوں کی طرف لوٹ رہے تھے جب میں نے اس کے کمرے کے سامنے قدم روکے۔ دروازہ پر چند بار انگلی بجائی تو اندر سے جہانگیر کی آواز آئی۔

"لیں۔ کم ان۔"

میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور آداب بجا لایا۔

"عرض کیا ہے۔ محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں۔"

مگر دوسرا مصرعہ جہانگیر نے پورا نہیں کرنے دیا لپک کر اٹھا اور گلے ملنے کا بہانہ کرتے ہوئے پکڑ کر بڑے زور سے مجھے بیڈ پر دے پٹخا۔ میرے ہاتھ سے بریف کیس چھوٹ گیا۔ جہانگیر میرے اوپر چڑھ بیٹھا اور پہلوؤں پر گھونسے برسانے لگا۔ میں چلایا۔

"احتجاج۔ احتجاج۔ جارحیت کے خلاف احتجاج۔ مجھے دیار غیر میں مارا جا رہا ہے۔"

مگر وہ اس وقت تھک کر ہٹا جب کنٹین کا بیرا کمرے میں رکھے ہوئے چائے کے خالی برتن لینے آیا۔ جہانگیر نے مجھے چھوڑ کر سانس درست کی اور بیرے کو آرڈر دیا۔

"ہر وہ چیز لے آؤ جو اس وقت کنٹین میں دستیاب ہو سکتی ہے۔"

میں نے گرہ لگائی۔ "مثلاً" دیگچے' چمچے' مرتبان' سگریٹوں کے خالی ڈبے۔" اور کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

رات دس بجے تک یہ قہقہے جاری رہے۔ دس بجے کے بعد جب نیند کی ڈوریاں آنکھوں میں ظاہر ہونے لگیں تو میں نے کہا۔

"جہانگیر۔ اس بار تم سے ملنے کا میرا ایک خاص مقصد ہے۔"

"مثلاً"۔" اس نے پوچھا۔

"صبح بتاؤں گا۔ اس وقت نیند بھی آ رہی ہے اور تم سنجیدہ بھی نہیں ہو۔"

"نہیں۔ میں سنجیدہ ہوں۔ تم بولو۔"

"نہیں۔ وہ بات اس قدر اہم ہے کہ تم رات بھر اس کے لئے اپنے ذہن کو استوار کرو۔"

"عجیب بات ہے۔ کچھ پتہ تو چلے کس نوعیت کی بات ہے۔"

"بس ہے ایک بات۔ پہاڑوں سے نہر نکالنے جیسی بات۔ تم خواہ کتنی ہی ضد کرو میں اس وقت نہیں بتاؤں گا۔"

اس نے بڑی ضد کی۔ ہر طرح سے پوچھنا چاہا مگر میں نے صبح سے پہلے بتانے سے انکار کر دیا۔ پھر جب صبح ہوئی تو غسل وغیرہ کرنے کے بعد ناشتہ کرتے ہوئے وہ میرے سر ہو گیا۔

"اب بتاؤ کیا بات ہے؟"

"کیا تم سننے کے لئے تیار ہو؟" میں نے پوچھا۔

"پوری طرح۔" وہ میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں آرام سے گھونٹ گھونٹ چائے پیتا رہا۔ چائے ختم کر کے میں نے پیالی ٹیبل پر رکھ دی اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"ایک قتل کرنا ہے۔"

ایک دو لمحے وہ خاموش سا میرے منہ کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"کیا تم قسم کھا سکتے ہو کہ تم مذاق نہیں کر رہے۔"

میں نے کہا۔ "قسم کھانے کی ضرورت نہیں جہانگیر۔ تمہیں یقین کر لینا چاہئے۔"

وہ میرا چہرہ پڑھنے میں مصروف تھا۔ جب وہاں اسے متانت ہی متانت نظر آئی تو بولا۔ "اب اگر یہ مذاق بھی ہے تو میں اسے یقین کی نظروں سے دیکھتا ہوں لیکن مجھے شک تمہاری بات میں نہیں تمہاری ذات میں ہے۔ تم تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ خیر۔ کل تم نے آتے ہی کیوں نہیں بتا دیا۔ اب چلو۔"

اس نے اس انداز میں بات کی جیسے مقتول باہر برآمدے میں قتل کئے جانے کے انتظار میں بیٹھا ہو۔ میرا پیار اکٹھا ہو تا گیا' ہو تا گیا۔ پھر میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مجھے یقین تھا جہانگیر کہ تم یہ نہیں پوچھو گے کہ قتل کیوں' کیسے اور کہاں کرنا ہے۔ مگر ٹھہرو کوئی تیاری ویاری کرو۔ بہت لمبا سفر طے کرنا ہے۔ ایک اجنبی دیس کی بات ہے۔ تفصیلات وہیں پہنچ کر بتاؤں گا۔"

لنچ قبل از وقت کر کے ہم نے اپنا سفر شروع کیا۔ کافی رات جا چکی تھی جب میں جہانگیر مہدی کے ساتھ پروفیسر دلاور کے شہر پہنچ گیا۔ ایک ہوٹل میں کمرہ لے کر رات کے بقیہ لمحے بسر کئے اور ابھی پو نہیں پھٹی تھی کہ میں جہانگیر کو لے کر اس مکان میں پہنچ گیا جو میں نے کرایہ پر لے رکھا تھا۔

سورج نکلنے ہی والا تھا۔ دروازہ بند کر کے میں نے جہانگیر کو اس کھڑکی کے سامنے بٹھا دیا جو پروفیسر دلاور کے مکان کی طرف کھلتی تھی۔ جالی ہونے کی وجہ سے کمرے کے اندر کا آدمی باہر سے نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے جہانگیر سے کہا کہ باہر کا جائزہ لیتا رہے خصوصاً" سامنے وہ جو مکان ہے اس میں آنے جانے والوں کو نگاہ میں رکھے۔

کوئی آٹھ بج کر بیس منٹ کے لگ بھگ پروین کتابیں سنبھالے کالج جانے کے

لئے نمودار ہوئی۔ میں نے جہانگیر سے کہا۔

"اچھی طرح پہچان لو۔ خوب غور سے دیکھو۔ ذہن میں اس کی تصویر جما لو۔ یہی مطلوبہ ہستی ہے جس کے لئے میں تمہیں اتنی دور سے لایا ہوں۔"

چند منٹ جہانگیر اس کے نقوش ذہن میں بٹھاتا رہا۔ پھر گھوم کر حیرانگی سے بولا۔ "مگر یہ سب کیا ہے؟ اس معصوم نے تمہارا کیا قصور کیا ہے؟"

میں نے جہانگیر کو کھڑکی کے سامنے سے ہٹاتے ہوئے وہ کھڑکی بند کر دی اور کہا۔

"اس نے مجھے قتل کر دیا ہے۔"

"ہت تیرے کی۔ جان ہی نکال دی تھی۔ میں کل سے دوستی کا نازک آبگینہ سنبھال سنبھال کر تھک گیا ہوں۔ مبادا میرا استقلال قائم نہ رہے اور یہ آبگینہ چور چور ہو جائے اور یہ بہروپیا کہیں کا۔ ایک چھوکری دکھانے یہاں لایا ہے۔ یونیورسٹی لے جا کر تمہاری ایسی خبر لوں گا کہ آئندہ مذاق کا نام تک نہ لو گے۔"

میں نے کہا۔ "جہانگیر مہدی۔ میرے دوست یہ مذاق نہیں۔ سنو میں تمہیں پوری بات سمجھاتا ہوں۔ اگر میں تمہیں ذہنی طور پر اتنا تیار نہ کرتا تو وہ کام جو میں تمہیں بتانے والا ہوں' کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوتے۔ تاہم وہ کام قتل سے کم نہیں۔ بات یہ ہے کہ تم مجھے بیوقوف کہو یا پاگل' مجھے اس لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔ تم حیران بھی ہو گے اور تمہیں افسوس بھی ہو گا یہ جان کر کہ میں اس قدر پست کردار بھی ہو سکتا ہوں مگر مجھ سے پوچھو' دل آنے کی بات ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کس وقت آ جائے۔ جب پہلو سے نکلتا ہے تو شخصیت نہیں پوچھتا' وقار کا لحاظ نہیں رکھتا۔ میں نے اس لڑکی کو گاڑی میں دیکھا تو ہوش قابو میں نہ رکھ سکا۔ اب یہ میری زندگی کا سوال بن گئی ہے۔ میں اسے ہر قیمت پر حاصل کروں گا۔ سولہ دن سے میں اس کرائے کے مکان میں پڑا ہوں۔ ہر مہذب صورت سے کوشش کر چکا ہوں مگر ناکام رہا۔ اب تمہاری مدد چاہتا ہوں۔"

چند ثانیے ٹھہر کر میں نے پھر کہا۔ "اب تمہیں کرنا یہ ہے کہ کسی تنہا سی جگہ پر اس پر دست درازی کرو اور اس انداز سے جیسے تم کوئی ماہر قسم کے اوباش انسان

ہو۔ میں اس کی عزت بچانے کے لئے تم سے الجھ پڑوں گا۔ اچھی بھلی لڑائی ہو گی۔ بے شک معمولی زخم بھی آ جائیں' کچھ کپڑے بھی پھٹ جائیں تو پروا نہیں۔ پھر تمہیں ہار تسلیم کرتے ہوئے میدان سے فرار اختیار کرنا ہو گا اور میں ... میرے لئے باقی کام بہت آسان ہو جائے گا۔"

جہانگیر مہدی نے جو ہنسنا شروع کیا تو ہنستا ہی چلا گیا۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں پانی چھلک آیا۔ کہنے لگا۔

"پھر چند لوگ اکٹھے ہو جائیں گے اور دونوں کو وہ ماریں گے کہ دل پہلو میں خود بخود واپس آ جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "صرف یہی ایک خطرہ نہیں اور بھی کئی خطرات ہیں جن پر ہم نے غور کرنا ہے مثلاً" کیس سے پہلے تمہیں روپوش رہنا ہو گا کہ کوئی تمہیں دیکھ نہ سکے۔ ایک ایسی جگہ کا انتخاب کرنا ہو گا جہاں ہم باآسانی یہ ڈرامہ کھیل سکیں اور کیس کے بعد فوراً" ہی تمہارا یہ شہر چھوڑ جانے کا بندوبست وغیرہ... مگر پہلے تم کسی طرح تسلیم تو کر لو کہ یہ مذاق نہیں۔ ایسا کرنا ہی ہے۔"

کافی دیر کے بعد میں اسے تیار کر سکا کہ یہ ڈرامہ کھیلنا ہی ہے۔ جب وہ اس کے لئے تیار ہو گیا تو ہم نے اس پر غور کرنا شروع کر دیا۔ شام تک ہم اس کے ہر پہلو پر بحث کرتے رہے۔ تمام مشکلات سمجھتے رہے اور ان کا حل تلاش کرتے رہے۔ رات تک ہم ہر طرح تیار ہو چکے تھے۔

دوسرے دن میں نے پروین کا محتاط تعاقب کر کے ایک ایسی جگہ بھی تلاش کر لی جو اس کھیل کے لئے موزوں ترین تھی۔ پروین کالج سے آتے ہوئے اپنے راستے کو مختصر کرنے کے لئے چند کھیتوں میں سے گزرنے کی عادی تھی اور ان کھیتوں میں راستہ ایک نشیبی جگہ میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ یہ جگہ سنسان بھی تھی اور محفوظ بھی۔ جہانگیر مہدی دو دن روپوش رہا۔ کیس کے بعد فرار کے لئے اس کے سامنے کوئی دشواری نہیں تھی۔ وہ کسی بھی ٹیکسی یا بس کے ذریعے فرار ہو کر غائب ہو سکتا تھا۔ تیسرا دن ہمارے اس ڈرامے کا دن تھا۔ رات کو میں نے جہانگیر کو وہ جگہ دکھائی تھی۔ وہاں راستے سے ہٹ کر چند گز کے فاصلے پر درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔

ایک پگڈنڈی ان درختوں سے نکل کر راستے سے آملتی تھی۔ مقررہ وقت سے کچھ دیر پہلے جہانگیر کو ان درختوں میں پروین کا انتظار کرنا تھا اور اس کے آنے پر اس پگڈنڈی سے ہو کر اس بڑے راستے پر آجانا تھا جبکہ پروین کے سامنے والے راستے سے مجھے آنا تھا۔

تیسرے دن ٹھیک مقررہ وقت پر ڈرامہ شروع ہو گیا۔

پروین ابھی نشیبی جگہ سے چند گز دور ہی تھی کہ جہانگیر درختوں سے نکل کر پگڈنڈی سے ہوتا ہوا بڑے راستے پر آکر اس کے ساتھ ہو لیا۔ قمیض کے ادھ کھلے بٹن 'پینٹ کا ایک پائنچہ چڑھائے اور بال بکھرائے وہ اس وقت ہوبہو کسی مے خانہ کا کارند بلانوش معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے پروین کو مخاطب کیا۔

"آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں۔"

پروین نے شرم و حجاب سے سمٹ کر اسے دیکھا تو جہانگیر نے فدویانہ انداز میں سلام کر دیا اور کہا۔

"ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی۔"

اس نے دوپٹہ کو اچھی طرح سر پر اوڑھ لیا اور قدم تیز کر لئے۔ ٹھیک نشیبی جگہ میں پہنچ کر جہانگیر نے سامنے آکر اسے روکا۔ اس نے بچ کر نکلنا چاہا تو اس کا دوپٹہ پکڑ لیا۔ پروین نے اسے چھڑانے کی کوشش کی تو دوپٹہ پھٹ گیا۔ جہانگیر نے آگے بڑھ کر اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا۔ پروین اس قدر بدحواس ہو گئی تھی کہ کتابیں اس کے ہاتھ سے گر پڑی تھیں۔ چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا تھا اور سانس اکھڑ سی گئی تھی۔ بدحواسی ہی میں اس نے جہانگیر کو دو تین تھپڑ جڑ دیے مگر جہانگیر نے اسے چھوڑا نہیں۔ ٹھیک وہ لمحہ تھا جب میں بیچ میں آگیا۔ ایک زوردار دھکا دے کر میں نے جہانگیر کو پروین سے الگ کیا اور کہا۔

"صورت سے ہی وحشی معلوم ہوتے ہو۔"

جہانگیر نے ایک لمحہ مجھے گھور کر دیکھا' اس کی آنکھوں میں واقعی سرخی کی پرچھائیاں تھیں۔ مجھے شک گزرا کہ کہیں کم عقل واقعی پی کر تو نہیں آگیا۔ ایک قدم آگے بڑھ کر اس نے میرے جبڑے پر جو گھونسہ لگایا تو دماغ چکرا گیا۔ میں

کتابوں سے سلپ ہوتا ہوا گر پڑا۔ مجھے ایک لمحہ کو خیال گزرا کہ اب دو تین دانتوں کی خیریت نہیں۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر دو چار گھونسے اور جڑ دیئے۔ گریبان پکڑ کر اس انداز میں جھٹکے دیئے کہ قمیض پھٹ گئی۔ پھر اتنی شاندار ایکٹنگ سے ایک کتاب سے خود سلپ ہو کر مجھے سنبھلنے کا موقع دیا کہ اسے داد دینے کو جی چاہا۔ میں نے فوراً" پلٹ کر حملہ کیا اور اس سرعت سے کہ جہانگیر کو سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ دراصل وہ خود بھی سنبھلنا نہیں چاہتا تھا۔ چار پانچ گھونسے کھانے کے بعد وہ لڑکھڑایا اور پیچھے ہٹتا ہٹتا بھاگ کھڑا ہوا۔ میرے منہ سے خون بہہ نکلا تھا جس نے پھٹی قمیض پر گر کر میری حالت ایک ایسے فلمی ہیرو کی سی بنا دی تھی جسے میک اپ کی ضرورت نہ رہی ہو۔ میں نے حالت سنبھالی' پروین کچھ کتابیں سنبھال چکی تھی کچھ سنبھال رہی تھی۔ میں اس سے لاپروا ہو کر یوں واپس چل دیا جیسے میں اس کی خاطر نہیں کسی اپنے عناد کا بدلہ لینے کے لئے جہانگیر سے لڑ پڑا تھا۔ ڈرامہ سو فیصد کامیاب رہا تاہم اس کی ریہرسل جس طرح کرتے رہے تھے اس سے بھی بڑھ کر پروین نے جلدی جلدی کتابیں سنبھالیں اور میرے پیچھے چل دی۔ وہ مجھ سے چند قدم پیچھے چل رہی تھی۔ میرا خاک آلود لباس' پھٹی ہوئی قمیض' منہ سے بہتا ہوا خون اور آنکھوں کے نیچے ورم اسے بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ وہ تھوڑ دور تک میرے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے قدم تیز کر کے فاصلہ کم کرنے کی کوشش شروع کر دی ہو اور تھا بھی یہی۔ وہ اب مجھ سے بس دو گز ہی پیچھے اور ایک پہلو میں ہو کر چل رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو۔ میں اس سے بالکل بے نیاز سا ہو کر جا رہا تھا۔ ایک دو بار اس کی ہمک میں نے صاف سنی جیسے بات اس کے منہ تک آکر پلٹ گئی ہو۔ پھر اس نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔

"میں آپ کو پہچانتی ہوں۔ آپ ہمارے پڑوسی ہیں۔"

میں نے ایک نگاہ غلط انداز سے اسے دیکھا اور پھر نظریں ہٹالیں۔ وہ کافی دیر تک خاموش رہی۔ جب مکانات کے قریب سڑک پر مجھ سے الگ ہونے لگی تو کہا۔

"میرا نام پروین ہے۔"

مگر میں اپنے کامیاب ڈرامے کا معاوضہ ان چند الفاظ میں وصول کرنے پر

قطعاً" راضی نہ تھا' سو بغیر کچھ جواب دیئے اپنے مکان کی طرف مڑ گیا۔ اندر پہنچ کر میں نے اپنا جائزہ لیا۔ سب خیریت تھی۔ صرف ایک دو خراشیں آئی تھیں۔ میں نے غسل کیا' لباس تبدیل کیا اور ٹی کارنر کے لڑکے کی لائی ہوئی چائے پینے کے بعد کچھ تازہ دم ہو کر بستر پر دراز ہو گیا۔ میں نے سوچا کہیں پروین پر حجاب غالب نہ آ جائے اور وہ جھگڑے کی بات والدین سے نہ کہہ سکے --- مگر نہیں ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اکھڑی ہوئی اور پھٹی ہوئی کتابوں کو کیسے چھپائے گی؟ تار تار دوپٹہ کہاں لے جائے گی؟ چنانچہ میں شام کے انتظار میں مگن ہو گیا۔

رات جب اچھی طرح تاریک ہو گئی تو دروازے پر کچھ آہٹ سنائی دی۔ میرا دل خوشگوار دھڑکنوں سے لبریز ہو گیا۔ آہٹ قریب آتی گئی۔ پھر کوئی بغیر اجازت ہی دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ یہ وہی تھا --- پروفیسر دلاور --- جس کا مجھے انتظار تھا۔ آج کے حادثے کی وجہ سے اس کے چہرے پر غصہ بھی تھا اور میرے لئے آنکھوں میں تشکر بھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوتے رک گیا۔

"تم۔ تمہیں میں نے پہلے بھی کہیں۔ اوہ۔ ہاں۔ ٹرین میں تم میرے ہمسفر رہے ہو۔"

میں ادب سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہا۔ "جی ہاں۔ میں نے بھی آپ کو پہچان لیا ہے آپ شاہین' شیر' شہنشاہ ہیں۔ تشریف لائیے؟"

اگر وہ غصے میں نہ ہوتا تو ضرور اپنے اس نام پر ہنس دیتا۔ مگر اس وقت اس کی حالت کچھ اور تھی۔

"کیا تم اس لڑکے کو جانتے ہو جس نے آج پروین کو چھیڑا ہے۔" میں نے ابھی جواب دینے کے متعلق سوچا ہی تھا کہ اس نے کہا۔

"میں اس لڑکی کی بات کر رہا ہوں جسے آج تم نے ایک غنڈے سے بچایا ہے۔ وہ میری بیٹی ہے۔"

میں نے انکار کر دیا۔ "جی نہیں۔ میں اسے نہیں جانتا مگر آئندہ وہ کسی لڑکی کو چھیڑنے کی جرات نہیں کرے گا۔ میں اسے بہت کچھ سمجھا آیا ہوں۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ "پروین نے مجھے ساری بات بتائی ہے۔ پھر بھی مجھے

اس کا پتہ لگانا ہی ہے۔ کسی نہ کسی طرح ایک بار وہ میرے سامنے آ جائے تو میں اس کا حساب چکا دوں۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"میں نے آپ کو ٹرین میں ہی اپنا نام بتا دیا تھا۔ میرا نام جمیل ہے۔"

"اور میں پروفیسر دلاور ہوں۔ تمہارے سامنے والے مکان میں رہتا ہوں۔"

چند ثانیے وہ خاموش رہا پھر ایک جلال کے ساتھ بولا۔ "عزیزم۔ تم نے میری بچی کی عزت بچا کر مجھ پر احسان کیا ہے۔ مگر میں زیادہ دیر کسی کا احسان مند رہنا گوارا نہیں کرتا۔ میں نے تمہیں ٹرین میں ٹھیک ہی کہا تھا کہ میں شاہین بھی ہوں' شیر بھی ہوں اور شہنشاہ بھی ہوں۔ تمہاری زندگی میں کوئی نہ کوئی کمی ضرور ہو گی۔ ہر انسان کی زندگی میں ایک آرزو' ایک خواہش ضرور ہوتی ہے۔ کیا تم مجھے اپنی خواہش بتا کر میری شہنشاہیت کی ایک جھلک دیکھنا پسند کرو گے؟"

میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میرا منصوبہ انتہائی کامیاب رہا تھا۔ اب اس کے ثمر آفریں ہونے کے لمحات آ گئے تھے میں نے اپنے تاثرات کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"وہ جھلک دیکھے بغیر ہی میں تسلیم کرتا ہوں کہ آپ ایک غیر معمولی انسان ہیں مگر بات یہ ہے کہ میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ اس غنڈے سے الجھتے وقت میرا ارادہ قطعاً" یہ نہیں تھا کہ اس لڑکی پر یا اس کے والدین پر احسان کروں۔"

"اس کو رہنے دو۔ میری بات کے دوسرے حصے کا جواب دو۔ کیا تمہاری کوئی آرزو ہے؟"

"ظاہر ہے۔ انسانی زندگی ہے ہی ارمانوں کے مجموعے کا نام مگر آپ کس طرح میری ناممکن الجھن کو ممکن بنانے کی قدرت رکھتے ہیں؟"

"اس کو بھی رہنے دو۔ صرف مجھے اپنی خواہش بتاؤ۔"

میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ گلے کو کھنکار کر صاف کیا اور کہا۔ "آپ وعدہ کرتے ہیں کہ میری وہ خواہش پوری کریں گے۔"

"وعدہ کرتا ہوں۔"

"پھر بھی مجھے خوف ہے کہ جب میں آپ سے اپنی مشکل عرض کروں گا تو آپ انکار کر دیں گے۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔ تم بیان کرو۔"

میں نے ایک بار پھر گلا صاف کیا اور اپنی پوری نیازمندی سمیٹ کر عرض کی۔

"بزرگوارم۔ عرض یہ ہے کہ میں ہپناٹزم کی مشقوں میں آگے نہیں بڑھ رہا' بہت کوشش کے باوجود میں صرف سیاہ داغ کو سفید کر سکا ہوں۔ اس کے آگے میں رک گیا ہوں اگر سجیشن پر غور کرتا ہوں تو کنسٹریشن رہ جاتی ہے۔ اگر کنسٹریشن پر خیال رکھتا ہوں تو سجیشن سے ہٹ جاتا ہوں۔ بس صرف تھوڑی سی "ول پاور" حاصل کر سکا ہوں' کیا آپ میری رہنمائی کریں گے؟"

جوں جوں الفاظ میرے منہ سے نکلتے جاتے تھے وہ چوکنا ہوتا جاتا تھا۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔ "تم کس طرح جانتے ہو کہ میں تمہاری اس سلسلے میں رہنمائی کر سکتا ہوں؟"

میں نے کہا۔ "ٹرین میں آپ کے ساتھ گزرا ہوا ایک ایک لمحہ آپ کی اس طاقت کی کہانی بیان کر رہا ہے۔ آپ اس طرح میری رہنمائی کر سکتے ہیں جس طرح ٹی ٹی کو بغیر چیکنگ واپس کر دیا تھا' جس طرح اخبار فروش کی فیاضی چھلک پڑی تھی اور جس طرح۔"

اس نے بات کاٹ دی اور کہا۔ "تم یہاں کیا کرتے ہو اور تم رہنے والے کہاں کے ہو؟"

وہ مجھ سے اس وقت بحیثیت ہپناٹائزر کے بات نہیں کر رہا تھا بلکہ ایک عام انسان کی طرح مخاطب تھا اور میرے لئے کھل کر بات کرنے کے کافی مواقع تھے۔
میں نے ایک لمحہ توقف کیا اور کہا۔

"میرا گھر یہاں سے سینکڑوں میل دور ہے' میں آپ کے شہر کے اردگرد پھیلے ہوئے فطرت کے مناظر سے کچھ حسن لے کر اپنی کہانیوں میں رنگ بھرنے کے لئے یہاں آیا ہوں --- مگر آپ بات کو شاید بدل رہے ہیں۔ آپ نے بڑے اصرار سے میری خواہش پوچھی ہے اور اسے پورا کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔"

اس نے قدرے برہم ہو کر کہا۔ "مدبر بننے کی کوشش مت کرو مسٹر۔ میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ آسمان کے کسی حصے کے تارے تمہیں پسند ہیں۔ مجھے دکھاؤ'

میں انہیں توڑ لاتا ہوں۔ انہونی بات مت کرو۔ مجھے اس دنیا کی اپنی مشکل بتاؤ۔ محبت' شادی' مقدمہ' دکھ' تکلیف' دشمنی' دوستی --- ہزاروں پریشانیاں ہو سکتی ہیں ان پریشانیوں کی بات کرو۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ میرے پرواز کے لئے تنے ہوئے پر خود بخود گر گئے۔ میں بجھ سا گیا۔ بالکل خاموش ہو کر میں نے سر کو جھکا لیا۔ چند منٹ وہ بھی خاموش رہا۔ میں نے کہا۔

"تو پھر۔ میرے محترم میری اور کوئی خواہش نہیں ہے۔ آپ کے وعدے کا بھی شکریہ اور اس کی پاسداری کا بھی۔"

"تم شاید ناراض ہو رہے ہو۔ نارمل ہو کر بات کرو۔ میں پھر آؤں گا۔ میں تمہارا احسان تمہیں ضرور واپس کروں گا مگر تمہاری اس خواہش کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ تم نے ٹرین میں میرے متعلق ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔ مگر عزیزم میں مجبور ہوں اس بات کا ذکر بھی نہ کرو۔ اس طاقت کے حصول میں میرے کئی برس ضائع ہوئے ہیں۔ بہت جانفشانی کی ہے تب کہیں جا کر اسے پا سکا ہوں۔ کتنے انسان اس کے لئے مجھ سے طلبگار رہے اور واپس چلے گئے۔ تم بھی ناراض مت ہو۔ تمہاری مہربانی اپنی جگہ بہت عظیم ہے مگر میں اس کا بدلہ اتنا بڑا نہیں دے سکتا۔ میں چلتا ہوں پھر ملوں گا۔" میں سر جھکائے رہا اور وہ اٹھ کر چلا گیا۔

وہ رات اداسیوں کی نذر ہو گئی۔ مدتوں کی ایک تمنا پوری ہونے کی ایک صورت نظر آئی تھی' وہ بھی ختم ہو گئی۔ برسوں کی سوئی ہوئی امید بیدار ہوئی تھی مگر صرف ایک کروٹ لے کر پھر سو گئی۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ صبح یہاں سے کوچ کر جاؤں گا اور اب زندگی بھر اس بیہودہ آرزو کو کبھی سر نہیں اٹھانے دوں گا۔ پھر ایک خیال آیا۔ وہ یہ کہہ کر گیا ہے کہ میں پھر آؤں گا۔ مجھے اس کا انتظار کرنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے وہ اپنا فیصلہ بدل کر آئے۔ اپنے سخت اصول میں لچک پیدا کر کے آئے۔

پتہ نہیں کتنی رات بیت گئی تھی جب میری آنکھ لگی اور صبح جب بیدار ہوا تو سورج نکل چکا تھا۔ میں ابھی بستر پر بیٹھا آنکھیں ہی مل رہا تھا کہ ایک چھوٹا سا لڑکا

ہاتھ میں ٹرے پکڑے کمرے میں آگیا۔ اس کی عمر بس اتنی ہی تھی کہ وہ بڑی مشکل سے ٹرے کو سنبھال کر لایا تھا۔ اس نے ٹرے بجائے میز پر رکھنے کے میرے بستر پر رکھ دی اور کہا۔ "آپ کا ناشتہ۔"

میں نے حیران ہو کر اس سے پوچھا۔ "کس نے بھیجا ہے؟"

"پارو نے۔"

"پارو کون؟"

"چچا دلاور کی لڑکی۔"

"اور چچا دلاور کون ہے؟"

اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "پارو کا باپ۔"

اس نے اس مشکل سوال کا جواب دینے اور نہ دینے کے درمیان کھو کر کہا۔

"وہ دونوں۔ پتہ نہیں۔ پارو نے کہا ہے جواب لے کر آنا۔"

"ناشتے کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔"

میں نے ٹرے پر سے کور ہٹا کر دیکھا۔ ٹرے میں چائے کے ساتھ کچھ کھانے کی چیزیں رکھی تھیں۔ ایک طرف کچھ تازہ پھول رکھے تھے اور ان پھولوں کے نیچے ایک لفافہ پڑا تھا۔ ازراہ تجسس میں نے لفافہ اٹھا کر اس میں دیکھا تو پروین کا ایک مسکراتا ہوا فوٹو نکل پڑا۔

ناگہاں مجھے رات کو کہے ہوئے اپنے الفاظ یاد آ گئے۔

"میری کوئی خواہش نہیں۔ آپ کے وعدے کا بھی شکریہ اور اس کی پاسداری کا بھی۔"

میں نے فوٹو واپس لفافہ میں ڈالا لفافہ پھولوں پر رکھ دیا اور لڑکے سے کہا۔

"منے۔ یہ ٹرے واپس لے جاؤ۔ میں ناشتہ ہوٹل پر کرنے کا عادی ہوں۔"

اور ٹرے اٹھا کر لڑکے کو تھما دی۔ اس کی مدد کے لئے دروازہ کھول کر اسے باہر نکالا۔ سامنے مکان پر نظر پڑی تو دروازہ کا پردہ ہلتا نظر آیا۔ پھر پردہ کچھ تھوڑا سا ایک طرف ہٹ گیا اور اس میں سے پروین کا آدھا چہرہ نظر آیا۔

لڑکا باہر نکل گیا تو میں نے دروازہ بند کر دیا اور باتھ روم کی راہ لی۔ اس دن

میں نے زرعی یونیورسٹی فون کر کے جہانگیر مہدی سے بات کی۔ وہ بحفاظت پہنچ گیا تھا۔

تین دن اور میں اس جگہ قیام کئے رہا۔ جلی ہوئی امید کی راکھ کریدتا رہا۔ عجیب بے کیفی سی طاری رہی۔ بے دل سا ہو کر میں دن کو یونہی ادھر ادھر گھومتا رہتا اور رات کو آ کر بستر پر دراز ہو جاتا۔

پھر تیسرے دن ایسا ہوا کہ میں ایک ندی کے کنارے ایک اداس صبح گزار کر واپس آ کر بغیر لباس تبدیل کئے بیڈ پر دراز ہو کر تکان اتار رہا تھا کہ دروازہ کھلنے کی آہٹ ہوئی۔ میں نے سر گھما کر جو دیکھا تو بے ساختہ سا ہو کر اتنی جلدی اٹھ بیٹھا جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔

ایک انتہائی حسین لڑکی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں اٹیچی تھا اور دوسرے ہاتھ میں پرس۔ اندر آ کر اس نے اٹیچی کرسی کے ساتھ رکھ دیا اور خود بڑے آرام سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اسی گھر کی رہنے والی ہو۔ نہایت سلجھا ہوا لباس پہنے آنکھوں میں بغیر کوئی تاثر لئے وہ کرسی پر بیٹھی تھی۔

میں بہت حیران سا اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ میری طرف۔ نہ مجھے کچھ سمجھ آ رہی تھی کہ اس سے کیا بات کروں اور نہ ہی اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ کچھ دیر بعد میں نے حواس یکجا کئے۔ ہوش سنبھالے اور اس سے پوچھنا چاہا کہ محترمہ آپ کون ہیں اور یہاں کس طرح؟ لیکن ابھی الفاظ میرے منہ میں ہی تھے کہ ایک بار پھر دروازہ کھلا اور پروفیسر دلاور اپنے پورے احتشام کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

کمرے میں اور کوئی کرسی نہیں تھی میں اٹھ کھڑا ہوا اور اسے بیڈ پر تشریف رکھنے کی پیش کش کی مگر وہ بیٹھا نہیں۔ کہنے لگا۔

"مجھے آج اپنے معمول میں ردوبدل کر کے یہاں آنا پڑا۔ میں بیٹھوں گا نہیں۔ بس تھوڑی دیر بات کروں گا پھر واپس چلا جاؤں گا۔ تم مسٹر جمیل۔ میرے عزیز۔ میری طرف دیکھو نا۔"

میں نے نظریں اٹھائیں تو اس کی آنکھوں میں کھو کر رہ گیا۔ اس نے اپنی پوری طاقت استعمال کر کے مجھے ہپناٹائز کرنا شروع کر دیا۔ چند لمحے اس کی آگ اگلتی نگاہوں میں سمویا رہا پھر وہ بولا۔

"تم نے مجھ پر ایک احسان کیا تھا۔ تین دن تک میں اس احسان کا بوجھ اپنی گردن پر اٹھائے رہا۔ میں نے چاہا تھا کہ تم مجھے اپنی زندگی کی کوئی اہم الجھن بتا دو جسے سلجھا کر میں تمہارا حساب بیباک کر دوں مگر بہت اصرار کے باوجود میں صرف اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تمہاری زندگی میں کوئی شکن نہیں۔ راحت ہی راحت ہے۔ تاہم میں نے اپنا بوجھ اتارنا ہی تھا۔ میرے عزیز تم جوان ہو اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں جوان آدمی کی سب سے بڑی خواہش حشر برپا کرتا ہوا حسن ہی ہوتا ہے۔ میں ان پہاڑوں میں متواتر تین دن اس حسن کو تلاش کرتا رہا ہوں اور آج جبکہ اسے پانے میں کامیاب ہو گیا ہوں تو اسے لے کر تمہارے پاس آگیا ہوں۔"

وہ تھوڑی دیر رکا۔ ایک گہری سانس لی اور لڑکی کی طرف دیکھا۔ لڑکی نے خودبخود اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑا۔ پھر ان دونوں کو ملا کر بولا۔

"میں اپنی طرف سے یہ انمول تحفہ تمہاری نذر کرتا ہوں۔ میں نے تمہارے احسان کا بدلہ اتار دیا ہے۔ اس کے پاس یہ جو اٹیچی ہے اس میں خاصی تعداد میں زیورات اور نقدی موجود ہے اور میرا خیال ہے دولت ایک جوان آدمی کی دوسری بڑی خواہش ہوتی ہے۔ تم یہ دونوں قبول کر لو۔"

میں اس کی باتوں سے نہیں بلکہ اس کے عمل سے سحرزدہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں مسلسل دیکھے جا رہا تھا اور وہ اپنی بات کہتا جا رہا تھا۔

"میں اب اطمینان حاصل کر سکوں گا۔ اب تم بھی یقین کر لو کہ میں بیک وقت شاہین بھی ہوں، شیر بھی شہنشاہ بھی۔ میرے اور بھی کئی روپ ہیں۔ مگر تمہارے لئے یہ ایک ہی کافی ہے۔ مجھے آئندہ زندگی میں ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ اب تم اپنا سامان پیک کرو۔ ٹیکسی بڑی سڑک پر کھڑی ہے۔ میں اسے قریب آنے کے لئے کہتا ہوں تم میرا یہ تحفہ سنبھالو اور ٹیکسی میں سوار ہو کر روانہ ہو جاؤ۔ کمرے کی چابی

مجھے دے دو یہ مالک مکان تک پہنچ جائے گی۔"

اس نے بات ختم کی اور باہر چلا گیا۔ اس کا ایک ایک لفظ میرے ذہن پر نقش ہو گیا۔

مجھے یقین ہو گیا کہ یہ حسین لڑکی میری سب سے بڑی ضرورت ہے۔ نہ جانے میں اس کے بغیر اب تک کیسے رہتا آیا ہوں اور اس کے لائے ہوئے زیورات اور روپے تو اگر آج ہی مجھے نہ ملتے تو میری زندگی بیکار ہو کر رہ جاتی۔ میں نے جلدی جلدی اپنا سامان پیک کیا۔ اس لڑکی نے بھی میری مدد کی۔ جب ہم اپنا اٹیچی اور ہولڈال پیک کر رہے تھے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم مدتوں اکٹھے رہے ہوں اور اب کسی نئے آشیاں کو آباد کرنے کے لئے کہیں دور پرواز کرنے کو تیار ہو گئے ہوں۔ جیسے وہ لڑکی واقف ہے کہ میری ہر چیز اس سے پہلے کس طرح سنبھالتی آئی ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب ہم پیکنگ سے فارغ ہو گئے تو ڈرائیور نے سامان اٹھا کر باہر کھڑی ٹیکسی کی ڈگی میں بند کیا۔ میں نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ٹیکسی میں آ کر بیٹھ گیا۔

جب ٹیکسی متحرک ہو گئی تو میں نے خدا حافظ کہنے کے انداز میں پروفیسر دلاور کی طرف دیکھا۔ وہ بھی الوداعی ہاتھ ہلا رہا تھا۔ اس کی نظریں ہم پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کے مکان کی طرف دیکھا۔ پردے میں اس وقت بھی ہلچل مچی تھی۔ وہ سرک رہا تھا اور پروین کا مکمل چہرہ سامنے آ گیا تھا۔ میں بہت دور سے پروین کے نقوش اتنے واضح نہیں دیکھ سکا۔ احساس غالب تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ہوں گے۔

جب تک ٹیکسی بڑی سڑک کا موڑ نہیں مڑ گئی ان دونوں کی نظریں اس پر جمی رہیں۔

ٹیکسی لمبے روٹ کے لئے بک کی گئی تھی۔ چند چوک عبور کرنے اور کچھ موڑ مڑنے کے بعد اس نے شہر کو پیچھے چھوڑ دیا۔ پھر جب ہم مضافاتی آبادی سے بھی نکل آئے تو میرے ذہن میں بیداری کی پہلی لہر ابھری۔ ایک ہلکا سا احساس پیدا ہوا۔ میں نے لڑکی کو ایک نظر دیکھا اور پھر تیزی سے گزرنے والے اردگرد کے مناظر میں کھو

گیا۔ جوں جوں ٹیکسی پہاڑوں سے نیچے اترتی چلی گئی' میرے ذہن کی غنودگی دور ہوتی چلی گئی۔ میرا دماغ اپنی اصلی حالت میں آ گیا۔ مجھے خیال آنے لگا کہ یہ کیسا انوکھا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ یہ میں اپنے ساتھ کسے لئے جا رہا ہوں؟ میں نے ایک بار پھر لڑکی کو دیکھا اور کچھ دیر غور سے دیکھتا رہا۔ روانہ ہونے سے پہلے مکان کے اندر کا منظر تیزی سے ذہن میں گردش کرنے لگ گیا۔ لڑکی کا یوں بے تکلفانہ کمرے میں آ جانا۔ پھر پروفیسر دلاور کا نزول' اس کی گفتگو' ہماری تیاری۔ سب ایک گہرے خواب' ایک چبھتے ہوئے سپنے کی شکل میں ذہن میں ابھر آئے۔ میں نے خود کو جگانے کی کوشش کی' اور جب ٹیکسی ایک خوبصورت ندی کا پل عبور کر رہی تھی تو میں نے بے ساختہ ڈرائیور سے کہا۔

"گاڑی روکو ڈرائیور۔ میں نیچے اتر کر کچھ سوچنا چاہتا ہوں۔"

اس نے میری طرف دیکھا اور پل عبور کر کے یہ کہتے ہوئے ٹیکسی کو بریک لگا دی۔

"آپ ٹیکسی میں بیٹھ کر نہیں سوچ سکتے؟"

میں نیچے اتر گیا۔ پھر میں نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ بھی نیچے اتر آئی۔ میں اسے ساتھ لئے سڑک سے ہٹ کر ندی کے کنارے تھوڑی دور تک ٹہلتا چلا گیا۔ ایک جگہ رک کر میں نے اسے سامنے کھڑا کیا اور پوچھا۔ "تمہارا نام؟"

"نورین۔" بڑا مختصر' بڑا معصوم سا جواب دیا اس نے۔ میں نے اس پر سر سے پاؤں تک نظر دوڑائی "کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟"

پتہ نہیں' کیا آگ چھپی ہوئی تھی میرے ان الفاظ میں کہ وہ چند سیکنڈ میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے اور اس نے نفی میں سر ہلا کر بڑی مدھم سی سرگوشی کی۔

"نہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "پھر تم میرے ساتھ کیوں چلی آ رہی ہو؟"

اس نے اسی مدھم سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "میرا جی چاہتا ہے۔"

مجھے ایک شاک سا لگا اور میں مکمل طور پر اپنے آپ میں واپس آ گیا۔ مجھ پر

نورین کی بے بسی واضح ہو گئی۔ وہ بھی عمل تنویم کی زد میں لا کر شکار کی گئی تھی۔ میں نے اسے جگانے کی کوشش کی۔

"نورین۔ بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ جب تم مجھ سے محبت بھی نہیں کرتیں اور میرے ساتھ آنے پر بھی تمہارا دل چاہ رہا ہے تو سوچو تمہارے جذبات میں یہ تضاد کیوں ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ آپ مجھے حکم دیتے رہیں اور میں تعمیل کرتی رہوں۔"

"تو پھر آؤ میرے ساتھ۔"

اور وہ میرے ساتھ چل پڑی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے ڈرائیور کو کہا۔

"واپس چلو۔ تمہیں اپنا معاوضہ صحیح طور پر ادا کیا جائے گا۔"

ڈرائیور نے دوسری طرف دیکھ کر منہ بنایا۔ پھر سٹیرنگ کاٹتا ہوا واپس چل پڑا۔ میں نے ٹیکسی میں نورین سے اس کے گھر کا پتہ لیا اور جب ٹیکسی شہر میں داخل ہو گئی تو ڈرائیور کو اس پتہ پر جانے کے لئے کہا۔ اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر میں نے ٹیکسی رکوائی' نیچے اترا' نورین کو اتارا اور بریف کیس سے ایک کاغذ نکال کر ٹیکسی کا سہارا لے کر ایک چٹ لکھی اور اسے نورین کے حوالے کر کے کہا۔

"تم اپنا سامان سنبھالو نورین اور گھر چلی جاؤ۔ اگر کبھی وہ شخص جو تمہیں میرے پاس لے آیا تھا' پھر ملے تو اسے میری یہ چٹ دے دینا۔"

اس نے اپنا اٹیچی اور پرس سنبھالا اور نسبتاً" زیادہ مسرور ہو کر گھر کی طرف چل دی۔ اس کی چال میں ایک مسرت عیاں تھی۔ اس کے قدم ایک خاص کیفیت میں اٹھ رہے تھے اور اس کی آنکھوں میں ایک لاشعوری مسکراہٹ تھی۔ شاید اس نے میرا یہ کہنا بھی میرا حکم ہی سمجھا تھا۔ تاہم میرا یہ حکم اس کے لئے شعوری اور لاشعوری ہر دو صورتوں میں خوش کن تھا۔

جب میں نے واپس ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈرائیور کو اپنے دیس کی طرف رخ کرنے کو کہا تو میں نے ایک نظر نورین کو دیکھا۔ وہ میری چٹ کھول کر پڑھ رہی تھی جس پر لکھا تھا۔

محترم پروفیسر دلاور۔

میں آہوں اور آنسوؤں کا یہ مجسمہ قبول کرنے کو تیار نہیں اور نہ ہی کسی کی عزت کی موت پر اپنی ہوس کی جیت کا روادار ہوں۔ اگر آپ مجھے تحفہ دینا چاہتے ہیں یا میرے احسان کا بدلہ چکانا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی ایسی لڑکی لا دیں جو ہپناٹائز ہو کر نہیں بلکہ خوشی سے میرے ساتھ جانے پر رضامند ہو۔ ایسی لڑکی بے شک اپنے ساتھ دولت بھی نہ لا سکے مگر اس کا شعور اور لاشعور دونوں مجھ سے محبت کرتے ہوں۔ میں اس لڑکی کا نام بتاتا ہوں --- اس کا نام پروین ہے۔

جمیل خاکوانی

مجھے یقین ہے کہ پروفیسر دلاور کا جواب میرے حق میں ہو گا۔

☆☆☆

موت کی جیت

وہ ٹھنڈے پانی سے لبریز ایک تسلہ اور شیونگ کریم ٹیوب اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہ شیونگ کریم منتظم کی ذاتی ملکیت تھی۔

معاون نے تسلہ اس کے پتھریلے بستر کے کنارے پر رکھ دیا اور اس میں سے کچھ پانی مٹی کے تیل کے دھوئیں کے میلے چکٹ کمبل پر چھلک گیا۔

"تم نے اسے کچھ زیادہ ہی بھر دیا تھا۔" جیمز نے اظہار خیال کیا۔ "میں نہانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔"

"ہم نہیں چاہتے کہ تمہیں ذرا بھی چرکا لگے۔"

جیمز نے سر گھمایا اور اپنے کندھے کے اوپر سے اسے چبھتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ "تمہارا مطلب ہے تم وقت سے پہلے میرا سر کاٹنا نہیں چاہتے۔"

"چھوڑو اس بات کو۔" منتظم نے بہت حد تک احتجاجی لہجے میں کہا۔ جیسے وہ اسے سمجھانا چاہتا ہو کہ اس کے فرائض کی ادائیگی میں مزاحم نہ ہو۔

"اپنا سر نیچے رکھو۔" حجام نے کہا۔ "میں اس وقت بری طرح نروس ہو رہا ہوں۔ ممکن ہے چرکا لگ ہی جائے۔"

وہ اپنا چہرہ اس کی کھوپڑی کے بالکل قریب لے گیا اور اسے بہت غور سے دیکھتے ہوئے اپنی زبان کی نوک منہ کے ایک گوشے سے باہر نکال لی۔ پھر اس نے کھوپڑی کی تہہ سے ریڑھ کی ہڈی کے بالائی سرے تک نہایت احتیاط سے استرا پھیرنا شروع کیا۔ منڈے ہوئے بالوں کے لچھے صابن کے جھاگ میں مل کر فرش پر گرنے لگے۔ نیچے سے جلد گلابی اور صاف ستھری نظر آنے لگی جیسی کہ عموماً آدمی کے تازہ تازہ شیو بنانے پر دکھائی دیتی ہے۔

"تم ٹیلکم پاؤڈر تو بھول ہی گئے۔" جیمز نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"چپ رہو۔" منتظم نے ناگوار لہجے میں کہا۔

"آخر تم لوگوں کو ڈر کس بات کا ہے۔ کیا میری گردن پر چند آوارہ بال بلیڈ کو میرا سر قلم کرنے سے روک لیں گے؟" جیمز نے حقارت سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کیا اس بلیڈ کی دھار زیادہ تیز نہیں ہے؟"

"یہ عمل انجام دینے کی ایک روایت چلی آ رہی ہے۔ یہ مت پوچھنا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔" منتظم نے جواب دیا۔ "میں یہ نہیں بتا سکتا کہ ان روایات کا آغاز کب ہوا۔ البتہ قیاس سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس وقت سے شروع ہوئی ہوں گی جب ہاتھوں سے ہر کام انجام دیا جاتا تھا اور لوگ گردن پر لمبی لمبی چوٹیاں رکھتے ہوں گے۔"

معاون تسلہ اور استرا لے کر باہر نکل گیا تھا۔ چند لمحے بعد ہی وہ واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹین کی ایک ٹرے تھی جس میں رم کا ایک گلاس رکھا ہوا تھا۔ یہ بھی ایک روایت تھی۔ اس نے شراب کا گلاس خاموشی سے موت کے سزا یافتہ مجرم کو پیش کیا۔

"واہ۔ کیا بات ہے۔ مجھے جو چیز پیش کی گئی ہے وہ اس غضب کی سردی میں نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔" جیمز مسکرایا اور مشروب کے دو بڑے گھونٹ لے کر جلاد کو دیکھنے لگا۔ تیسرا گھونٹ لے کر وہ کھانسا اور گلاس معاون کی طرف بڑھا دیا۔

"سگریٹ پیو گے؟" معاون نے جیب سے پیکٹ نکال کر جیمز کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے ایک شان بے نیازی سے سگریٹ لیا اور ہونٹوں میں دبا کر بولا۔

"حکومت ان دنوں بڑی شاہ خرچ ہو گئی ہے۔ موت کے ایک سزا یافتہ مجرم کو سگریٹ پیش کرنا ملک و قوم کے قیمتی سرمائے کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔"

منتظم نے ایک دیا سلائی اپنے جوتے کے تلوے سے رگڑ کر جلائی اور اس کا سگریٹ سلگانے کے لئے اسے ہاتھ سے ڈھانپ لیا۔ جیمز نے سگریٹ کا ایک زوردار اور طویل کش لے کر دھویں کا بگولا سا خارج کر دیا جو تقریباً پوری کوٹھڑی میں چھا گیا۔ جب دھویں سے فضا صاف ہوئی تو کھلے دروازے پر ایک پادری کھڑا نظر آیا جو انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جیمز نے انکار کے انداز میں اس کی طرف اپنا ہاتھ لہرایا۔ "نہیں شکریہ۔ میرا

تعلق یقیناً ان لوگوں سے نہیں ہے جو آخری بازی ہار کر رقم ادا نہیں کرتے اور بھاگ لیتے ہیں۔"

"اس جیسا آدمی اس سے پہلے نہیں دیکھا۔" منتظم نے اپنے معاون سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ اس نے دستاویز نکالی جو تہیں کھولنے کے دوران بری طرح کڑکڑائی۔ پھر اس نے آہستہ سے اپنی جگہ بدلی اور کوٹھڑی کے عین وسط میں پہنچ گیا۔ اس نے اپنا گلا صاف کیا اور بولا۔

"توجہ سے سنو۔"

جیمز نے ایک ابرو کے اشارے سے تمسخر آمیز انداز میں سیلوٹ کیا۔

"تم پر ڈیوڈ کے قتل کا جرم ثابت ہو جانے کے باعث۔"

"مجھے کسی ایسی بات سے آگاہ کرو' جس کا علم مجھے نہ ہو۔" جیمز نے ایک دم اسے ٹوک دیا۔

☆○☆

"میری بیوی کے معاملے میں مشکل یہ ہے کہ وہ مجھے سمجھ نہیں پائی۔" فربہ اندام شخص نے جین کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

"بے چارہ ڈگلس۔" جین خود کلامی سے زیر لب بڑبڑائی۔ اس نے ایک ہاتھ اس کی توند پر اس انداز میں رکھنے کی کوشش کی کہ کہیں وہ اس کے نیچے دب نہ جائے لیکن اس کا ہاتھ کلائی تک اس کی توند میں غائب ہو گیا۔ وہ بار کے سرے والے آخری اسٹول پر بیٹھی ہوئی تھی اور وہ اس کے ساتھ دوسرے اسٹول پر براجمان تھا۔ اس نے پھر اپنے آپ کو سنبھالا اور جین نے اس کی مختلف اشیا سے پھولی ہوئی واسکٹ سے ہاتھ باہر کھینچ لیا۔

"میں اپنی بیوی کے بارے میں باتیں کرنا پسند کرتا ہوں۔" وہ بولا۔ "اس کے بارے میں دوسری عورتوں سے باتیں کرنا مجھے بیحد پسند ہے۔ کیا تم اس کی تصویر دیکھنا پسند کرو گی؟"

"یقیناً"۔ مجھے اس کی تصویر دیکھ کر خوشی ہو گی۔"

اس نے واسکٹ کی جیب سے تہہ کیا کاغذات کا ایک بڑا سا پلندہ نکالا۔ لیکن

اس سے اس کی توند کے پھیلاؤ میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس نے پورے کاؤنٹر پر ایک مڑا تڑا بزنس کارڈ، خطوط، یادداشتیں اور اس قسم کے کاغذات پھیلا دیئے۔

"یہ رہی تصویر۔" اس نے ایک تصویر اٹھا کر جین کے ہاتھ میں تھما دی۔ "یہ تصویر میں ہمیشہ اپنے ساتھ لئے پھرتا ہوں تاکہ دوسری عورتوں کو دکھا سکوں۔"

"یہ عورت تمہارے لئے موزوں نہیں ہے ڈگلس۔" اس نے تصویر کو اپنے چہرے کے سامنے کر لیا تھا۔ لیکن اس کی نگاہیں تصویر کو نظرانداز کر کے دو انچ نیچے بار پر پڑے ایک لفافے پر تحریر نام اور پتہ پڑھ رہی تھیں۔

ڈیوڈ

۹۰ ریٹی گن سٹریٹ

"چلو اٹھو، میرے گھر چلو۔ یہاں بیٹھنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ نجانے تم اتنا اصرار کر کے مجھے یہاں کیوں لے آئیں۔ آؤ۔ میرا گھر زیادہ دور نہیں ہے۔ میں تمہیں اپنا سمندری گھونگوں کا ذخیرہ بھی دکھاؤں گا۔"

"لیکن تمہارے ملازمین کیا سوچیں گے؟"

"پہلے یہ سارا مال مسالہ تو اپنی جیبوں میں بھر لینے دو۔ نہیں۔ اپنا ہاتھ نیچے ہی رکھو۔ یہ کام میں تمہارے لئے انجام دوں گی۔ میں تم جیسی منفرد شخصیت کے حامل آدمی کی خدمت کرنا پسند کرتی ہوں۔ یہ میں اس جیب میں ڈالوں گی اور یہ اس نیچے والی جیب میں۔ تمہیں سب چیزیں ایک ہی جیب میں نہیں ٹھونسنا چاہئیں۔ بلکہ چیزوں کی تقسیم کر کے پھیلا دیا کرو۔ اس سے تمہاری جسمانی حالت اچھی لگے گی۔ پھر تمہارا جثہ ہے بھی بہت اچھا اور متناسب بشرطیکہ تم ذرا سلیقے سے اس کی نمائش کا اہتمام کرو۔"

"تم کتنی سمجھدار ہو۔ وہ تو مجھے موٹا کہتی ہے۔"

"ہونہہ۔ کیا مضحکہ خیز بات ہے ڈگلس۔ میں ان پتلے دبلے آدمیوں کو پسند نہیں کرتی جو بانس کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔" اس نے بٹوے کو اس کی اندرونی جیب میں ڈالنے سے پہلے ہاتھ میں تولا۔ "کیا تم ہمیشہ اتنی بھاری رقم ساتھ رکھتے ہو؟ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔"

"یہ میرا آج شام تک کا جیب خرچ ہے۔ اس سے سوگنا رقم تو میرے گھر میں رکھی رہتی ہے۔ میری بیوی سال میں ایک بار ہی شہر جاتی ہے اور میں اس کی غیر حاضری میں جی بھر کے عیش کرتا ہوں۔ آؤ چلیں۔ ہم وہاں بیٹھ کر زیادہ سکون اور اطمینان سے باتیں کر سکیں گے۔"

"لیکن اس سے پہلے میوزک باکس پر مجھے صرف ایک دھن اور بجا لینے دو۔"

"نہیں۔ اس سے میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔"

"صرف میری خاطر ڈگلس۔" اس نے موٹے کی ٹھوڑی پکڑ کر ٹٹولی اور موسیقی کی اس مشین کی جانب چل دی جو ایک سکے کے عوض گاہکوں کو ان کے پسندیدہ گیت اور دھنیں سناتی تھی۔ اس وقت ایک اور گاہک بھی یہی شغل کرنے کے موڈ میں تھا۔ وہ ایک سکہ لئے مشین میں ڈالنے کے لئے مخالف سمت سے اس طرف بڑھا۔ وہ دونوں بیک وقت مشین کے پاس پہنچے۔ پہلی باری کا دعویٰ جتانے کے لئے دونوں نے ایک دوسرے کو سرد نگاہوں سے گھورا۔

"اگر آپ برا نہ منائیں تو پہلے میں اپنی پسند کا ریکارڈ بجا لوں۔ پھر آپ زحمت کر لیں۔" وہ خاصی بلند آواز میں بولی۔

"آپ نے آج شام سے اس پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔" اس آدمی نے جلے کٹے لہجے میں جواب دیا۔ "آپ کسی اور کو موقع کیوں نہیں دیتیں؟"

سٹول پر بیٹھا فربہ اندام آدمی متفکر سا نظر آنے لگا کہ کہیں بات بڑھ جانے پر اسے جین کی حمایت میں نہ بولنا پڑ جائے۔

جین نے اپنا سکہ زور سے مشین کے اوپر پٹخا جیسے اپنی پہلی باری کا حق جتانا چاہتی ہو۔ پھر جھک کر سکہ ڈالنے کی سلاٹ کے قریب لگی نغمات کی فہرست کا جائزہ لینے لگی۔

"ڈیوڈ۔ گھر پر کوئی فرد موجود نہیں۔ وہاں نوٹوں کی ایک بڑی گڈی غیر محفوظ پڑی ہے۔ تیزی سے کام انجام دے ڈالو۔ تمہاری واپسی تک میں اسے یہیں روکے رکھوں گی۔"

جین نے مشین پر سے سکہ اٹھایا اور سلاٹ میں ڈال کر اپنے پسندیدہ نغمے کا

بٹن دبا دیا۔ اس عمل میں پیتل کی ایک چابی اس کے ہاتھ سے نکل کر مشین کے اوپر ہی پڑی رہ گئی لیکن زیادہ دیر تک نہیں۔ اس آدمی نے اپنی کہنی کیبنٹ پر جھکائی اور چابی غائب ہو گئی۔

مشین ایک بیہودہ سا گیت گھٹی گھٹی آواز میں الاپنے لگی۔

"ان جگہوں پر ایسے ہی ذلیل لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔" جین نے اپنے گول مٹول ساتھی سے شکایت کی۔ "تم نے دیکھا' کیا ہوا۔ محض اس وجہ سے کہ میں نغمہ سننے کے لئے اس سے پہلے مشین میں سکہ ڈالنا چاہتی تھی۔"

"آؤ چلیں۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ جگہ مجھے بالکل نہیں بھاتی۔"

"لیکن جانے سے پہلے چند گھونٹ اور کیوں نہ پی لیے جائیں؟ بس تمہارے ساتھ چند گھونٹ اور۔"

جین نے بار ٹینڈر کی طرف رخ کیا اور آنکھ مار کر بولی۔ "دو پیگ تیز قسم کے بناؤ۔ ہم دونوں اپنے موڈ کو خوشگوار بنانا چاہتے ہیں۔"

ایک جام کئی جاموں تک پہنچ گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے اپنے مے نوشی کے ظرف کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ اس کا رنگ تیزی سے متغیر ہونے لگا۔ جب اس کا رنگ سبزی مائل ہو گیا تو اس نے دھپ سے ایک ہاتھ اپنے منہ پر رکھا۔ دھچکے کے ساتھ اسٹول سے اٹھا اور قریب کے اندرونی دروازے میں گھس گیا۔

"موسم طوفانی ہو چکا ہے۔" جین نے بارمین سے معنی خیز انداز میں کہا۔

پانچ منٹ بعد وہ پھر ڈولتا ہوا باہر آیا۔ اس بار اس کا ہاتھ سر کی چوٹی پر رکھا ہوا تھا گویا اسے اوپر اڑنے سے بچانا چاہتا ہو۔ وہ جین کے قریب سے گزرتا ہوا اس انداز میں باہر کی طرف چل پڑا جیسے اب وہ سامنے کی طرف دیکھنے کے قابل ہی نہ رہا ہو۔

"ٹھہرو ڈگلس۔" وہ گھبرا کر چلائی اور اپنی نشست سے اچھل کر اتری۔ "ابھی تم جا نہیں رہے ہو۔ ٹھیک ہے ناں؟"

اس کی آنکھیں جین کی طرف گھومیں لیکن اس پر مرکوز نہ ہوئیں۔ اس وقت وہ سخت تکلیف میں تھا۔ اس کی نظر میں جین کا اب کوئی وجود نہیں رہا تھا اور اس

کے دل میں رازونیاز کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔

"اوہ۔ مجھے یہاں سے نکل جانے دو۔" وہ تھرتھرایا۔

جین نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ اس کے کوٹ کے پیچھے کا نچلا حصہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اسے واپس کھینچنا شروع کیا۔ نشے میں ہونے کے باوجود وہ بہت بھاری تھا اور وہ اس کے مقابلے میں خاصی ہلکی تھی۔ وہ اس کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی۔ "رک جاؤ۔ ایک منٹ کے لئے بیٹھ جاؤ۔ میں حواس کو درست کرنے کے لئے کوئی چیز پلاتی ہوں۔"

اس نے سخت اذیت کے عالم میں جین کو دھکیل کر پیچھے ہٹا دیا۔ "اوہ۔ دور ہٹ جاؤ مجھ سے۔ جب میری طبیعت ناساز ہوتی ہے تو میں غیر عورتوں کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا۔ مجھے اس وقت اپنی بیوی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اوہ۔ اس ذلیل شہر میں جانا اس کے لئے کیا ضروری تھا؟ جب کبھی میں۔ میں۔ ہوتا ہوں تو وہ میرے سر پر ٹھنڈی چیزیں رکھتی ہے اور میرا ہاتھ تھامے رکھتی ہے۔ میں۔"

اس کے بعد اس نے کیا کہا؟ کسی کو کچھ سنائی نہ دے سکا کیونکہ وہ لہراتا ہوا باہر گلی میں نکل گیا تھا۔ پھر وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھا اور نو دو گیارہ ہو گیا۔

جین کے سوا کیفے میں موجود ہر شخص ہنس رہا تھا۔ وہ بار پر اپنی مخصوص جگہ پر آ بیٹھی۔ اس کا منہ بری طرح لٹک گیا تھا۔ "کاش۔" اس نے سوچا۔ "میں نے اس کا فون نمبر ہی معلوم کر لیا ہوتا۔ لیکن نہیں۔ فون کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ وہ جواب نہیں دیتا۔"

"حوصلہ نہ ہارو۔" بار ٹینڈر نے اسے دلاسہ دیا۔ "اس کی ضرورت نہیں۔"

"تم نہیں سمجھتے۔ اگر وہ جلدی گھر پہنچ گیا اور اس نے وہاں جیمز کو پکڑ لیا تو جیمز بلاشبہ اسے جان سے مار دے گا۔"

☆○☆

منتظم یکساں لہجے میں تسلسل کے ساتھ بولتا چلا گیا۔ پھر اس نے حکمنامہ تہہ کر کے واپس جیب میں رکھ لیا۔ جیمز لکڑی کے چبوترے نما بستر پر منتظر بیٹھا سیٹی میں پریڈ کی ایک دھن الاپ رہا تھا۔ "کیا ڈرامہ ختم ہو گیا؟ بہت خوب۔" وہ چہکا۔

سپیدہ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ اندھیرا تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ جیمز اٹھا۔ پتلون کو کھینچ تان کر درست کیا اور کوٹھڑی کے دروازے کی طرف چل پڑا۔ انہوں نے جو سگریٹ دیا تھا وہ اب تک اس کی انگلیوں کے درمیان موجود تھا۔ منتظم اس کے ایک طرف اور معاون دوسرے پہلو میں چلنے لگا۔

دو محافظ کوٹھڑی کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ایک اس طرف' دوسرا اس طرف۔ جیمز کوٹھڑی سے نمودار ہوا تو انہوں نے منتظم اور اس کے معاون کی جگہ لے لی۔ پادری نے دبے پاؤں اس کے قریب ہونے کی کوشش کی لیکن جیمز نے ہاتھ جھٹک کر اس سے کہا۔

"میں نہیں چاہتا کہ کوئی سائے کی طرح میرے پیچھے لگ جائے۔ مجھے زیادہ دور نہیں جانا ہے اور میں وہاں تنہا پہنچ سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں کچھ غوروفکر بھی کرنا چاہتا ہوں۔ میرے گردوپیش کسی قسم کی بڑبڑاہٹ سنائی نہ دے تو میں بہتر طور پر سوچ سکتا ہوں۔"

"کیا تم اپنے گناہوں کی معافی مانگنا نہیں چاہتے۔ میرے غریب بیٹے؟"

"اور کسی وقت مانگ لوں گا۔" جیمز نے درشت لہجے میں جواب دیا۔ "گناہوں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ سردست سب کے سب یاد نہیں آ سکتے۔ ان کا ریکارڈ رکھنے کے لئے ایک اکاؤنٹنٹ درکار ہو گا۔"

"لیکن اس کے لئے تمہیں دوسرا موقع کہاں نصیب ہو گا۔ تھوڑی دیر بعد زندگی کی رسی ہاتھ سے نکل جائے گی۔"

جیمز نے اپنے ساتھ قدم زن پتھرائے چہرے والے ایک محافظ کی طرف دیکھا اور بڑی خوش مزاجی سے بولا۔ "بعض لوگوں پر جھڑکیوں اور ڈانٹ پھٹکار کا ذرا اثر نہیں ہوتا۔"

"سینہ دیکھو کیسا تنا ہوا ہے۔" معاون نے تعجب کا اظہار کیا۔ "اس آدمی کی کھال زرہ بکتر کی طرح موٹی ہو گی۔"

"یہ سب دکھاوے کی ہے۔" محافظ نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔ "جب یہ آخری زینے پر پہنچے گا تو ہمیں یہ چیختا ہوا دکھائی دے گا۔"

جیمز راہداری میں دونوں محافظوں کے درمیان چلتا ہوا اب تک اس سگریٹ کے کش لے رہا تھا جو اسے دیا گیا تھا۔ دھواں اس کے کندھے کے اوپر سے لمبی کلغی کی طرح پیچھے جا رہا تھا۔

☆○☆

جین تھوڑی دیر تک ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بار کے آخری سرے کے اسی اونچے سٹول پر بیٹھی شراب سے شغل کرتی رہی جس پر وہ ہمیشہ بیٹھتی تھی۔ اس سے دوسرے سٹول پر گہرے سوٹ میں ملبوس ایک شخص بیٹھا ہوا تھا جس کا رنگ زرد تھا۔ اس کے ہیٹ کا کنارہ اس قدر ڈھلوان تھا کہ چہرے کے بالائی نصف حصے پر آنکھوں کے سیاہ نقاب کی سی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اس آدمی کے آگے ایک اور شخص بیٹھا تھا اور ان دونوں کے درمیان ایک سٹول خالی پڑا تھا۔ آس پاس چند میزیں لگی ہوئی تھیں۔ ان پر ایک یا دو مستقل گاہک بیٹھے ہوئے تھے۔ گوشے میں ایک پلییئر پیانو پڑا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے دوسرا آدمی اپنی جگہ سے اٹھ کر پیانو کے پاس جاتا اور اس میں ایک واشر ڈال دیتا جو اس نے کاؤنٹر سے خریدا تھا۔ اس کے ساتھ ہی پیانو پر پرانے وقتوں کا کوئی بھولا بسرا نغمہ بجنے لگتا۔

جین آج رات کچھ زیادہ ہی جچ رہی تھی۔ اس نے گلہری کے فر والا کوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ دائیں ہاتھ کی انگلی میں اوسط درجے کے ہیرے کی انگوٹھی نظر آ رہی تھی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کے اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ مسلسل گلاس سے کھیل رہی تھی۔

بارٹینڈر سرکتا ہوا بار کے اندرونی کنارے پر اس کے قریب آیا اور خشک لہجے میں بولا۔ "اگر ضرورت ہے تو اپنے ناخن تراش لو لیکن میرے گلاس مت توڑنا۔"

جین نے گلاس چھوڑ دیا جو کھنکتا ہوا فرش پر لڑھک گیا۔ ڈھلوان کنارے پر بیٹھے ہوئے آدمی نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ "نروس ہو رہی ہو سسٹر؟"

"تو تمہیں اس سے کیا دلچسپی ہے؟" اس نے نفرت سے بھڑک کر جواب دیا۔

وہ پھسل کر سٹول سے اتری اور بار کے ساتھ ساتھ بیرونی دروازے کی طرف چل دی لیکن کسی چیز نے معاً اسے روک لیا۔ اس نے نیچے کی طرف دیکھا۔ ایک

آدمی کی پھیلی ہوئی ٹانگ نے اس کا راستہ روک رکھا تھا۔

"آپ کو جانے کی کیا جلدی ہے؟" اس آدمی نے کہا۔ وہ فلرٹ کرنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔

اس نے اشتعال انگیزی کو سمجھتے ہوئے بڑی خوش اسلوبی سے اپنے آپ پر قابو پایا۔ "میں اس دروازے میں جا رہی ہوں۔ اس میں۔" اس نے اپنے کندھے کے اوپر سے انگوٹھے سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اوکے۔ لیکن تم غلط راستے کی طرف مڑ گئی تھیں۔ اور بس۔" اس کی ٹانگ بدستور سد راہ بنی ہوئی تھی۔

وہ گھومی اور دوسری سمت ہو لی۔ پھر وہ ایک دروازے میں داخل ہو گئی۔ دروازہ اس نے اپنے پیچھے بند کر لیا۔ دیوار پر دھات کی چھوٹی سی تختی نظر آ رہی تھی۔ "خواتین کے لئے۔" اندر آ کر اس کے حواس بجا ہوئے۔

وہ مقابل کی دیوار میں کھڑکی کے پاس پہنچی۔ شیشہ اندھا ہونے کی حد تک دھندلا تھا کیونکہ اس کی ساخت ہی ایسی تھی اور اوپر سے سلیٹی رنگا کے گرد کی پرانی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ جسے برسوں سے صاف کرنے کی زحمت نہیں کی گئی تھی۔ اس نے شیشے کے فریم کی نچلی پٹی پر لگے ننھے ہینڈلوں میں انگلیاں ڈالیں اور فریم کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی مگر فریم اپنی جگہ جم کر رہ گیا تھا۔

اس نے اپنا ایک ریشمیں گھٹنا اٹھا کر کھڑکی کی نچلی سل پر سہارے کے لئے جمایا اور فریم کو اٹھانے میں اپنی پوری طاقت صرف کر دی لیکن بیسود۔ آخر اس نے اپنی ہتھیلی کے کنارے سے فریم کو ڈھیلا کرنے کے لئے اس پر ضربیں لگانا شروع کر دیں۔ اچانک اس نے پلٹ کر کندھے کے اوپر سے پیچھے کی طرف دیکھا کہ کہیں وہ زیادہ کھٹکا تو نہیں کر رہی مگر خوش قسمتی سے وہ دوسرا آدمی مسلسل پیانو بجا رہا تھا۔ اس وقت پیانو کی آواز بہت بلند تھی۔ اسے اطمینان ہو گیا کہ کھٹکے کی آواز باہر سنائی نہیں دے گی۔

اس نے پوری طاقت سے کھڑکی کے فریم پر مکا مارا اور فریم ایک دو انچ اوپر سرک گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ نیچے ڈالے اور تمام تر جسمانی قوت صرف کر کے

فریم کو اوپر سرکانے میں کامیاب ہو گئی۔ تب اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور چہرہ مایوسی کی شدت سے بگڑ گیا۔ اس نے کھڑکی کی سل پر رکھی ہوئی ٹانگ آہستہ آہستہ دوبارہ فرش پر رکھی اور پیچھے ہٹ گئی۔ فریم تو اوپر اٹھ گیا تھا لیکن اب سیاہ رنگ کی موٹی موٹی سلاخیں اس کا راستہ روکے کھڑی تھیں۔

وہ ایک منٹ بعد سگریٹ کے کش لگاتی ہوئی بار میں واپس آئی۔ جب وہ اپنے سٹول پر دوبارہ آن بیٹھی تو تیسرے اسٹول پر قابض آدمی نے اسے مڑ کر دیکھنے کی زحمت نہ کی۔ صرف بڑبڑایا۔ "سلاخوں کے درمیان سے تمہیں باہر کا منظر کیسا لگا؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوسرے آدمی نے ابھی ابھی میوزک بکس تک کا پھیرا لگایا تھا۔ نغمے کے شور میں اس نے بے چینی سہ کر جلدی سے بارٹینڈر کو پکارا۔ "ایک برانڈی دو مجھے۔ جلدی۔"

ابھی بارمین نے گلاس سے ہاتھ ہٹایا ہی تھا کہ جین نے اسے خالی کر دیا۔ جیمز گلی کے دروازے سے بار کی طرف چلا آ رہا تھا۔ تینوں میں سے کسی نے اس کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ نہ جین نے اور نہ ہی ان دونوں آدمیوں نے۔ جیمز،جین اور پٹی کوٹ والے آدمی کے درمیان خالی سٹول پر آ بیٹھا۔ وہ آدمی دوسروں کی طرف دیکھنے لگا اور جین کی نگاہیں فرش پر مرکوز ہو گئیں۔

جیمز نے بارمین کو آنکھ ماری اور بولا۔ "اپنے اس حسین گاہک سے میرا تعارف تو کراؤ۔"

اس کی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ جین نے سر اوپر نہ اٹھایا اور بارمین کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"آپ کیا پسند کریں گے موسیو؟" اس نے بوجھل سے رسمی لہجے میں پوچھا۔

"ہینسی اور خاتون کے لئے ایک بئیر ---"

اس پر جین کا ایک ہاتھ اوپر اٹھا۔ "میں تمہیں نہیں جانتی۔" اس کی آواز میں خوف کی آمیزش تھی۔ "میں اجنبیوں کو اپنے لئے کچھ خرچ کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔"

جیمز کے چہرے پر شدید تاثرات نمایاں ہوئے۔ "تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟" وہ مدھم سی آواز میں سرسرایا۔

وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "اس سے پہلے میں نے آپ کو اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ کیا میں یہاں آنے والے ہر اجنبی کا ہدف بنے بغیر نہیں بیٹھ سکتی؟"

اس نے کچھ سمجھ جانے والے انداز میں سرہلایا۔ "اوہ میں سمجھ گیا۔" ہڈی کی شکل میں لپٹی نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی بار پر جین کی طرف لڑھکنے لگی جس الاسٹک سے اس گڈی کو باندھا گیا تھا' اس میں ہیرے کی ایک انگوٹھی بھی پھنسی ہوئی تھی۔ "یہ لو اپنے لئے نئی یادداشت خریدو۔"

اس نے دہشت زدہ ہو کر بارمین سے التجا کی۔ "کیا تم اس شخص سے نہیں کہہ سکتے کہ مجھے تنہا چھوڑ دے۔" اس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔ "میں ایک معزز عورت ہوں۔ اس رقم سے اس کا کیا۔" ---- اس کی بات ادھوری رہ گئی اور آنکھیں پھیل گئیں۔

جیمز کی پشت کی طرف سے ایک ہاتھ اوپر اٹھا اور اس کے کندھے پر جم گیا۔

وہ مڑا اور اس کی نگاہیں اس بازو سے گزرتی ہوئی ڈھلوان کنارے کے ہیٹ والے آدمی کے چہرے پر جا ٹھہریں۔ وہ آدمی اب اس کے ساتھ کھڑا تھا اور دوسرا شخص اس کے پیچھے آن کھڑا ہوا۔

"کم آن۔ آؤ چلیں اور کچھ بات چیت کریں۔" پہلے نے جیمز سے کہا۔

"مثال کے طور پر پلک جھپکتے میں امیر و کبیر بن جانے کے موضوع پر باتیں۔ کیا خیال ہے؟" اس نے نوٹوں کا بنڈل اور ہیرے کی انگوٹھی اٹھا لی تھی۔

اور جب وہ دونوں جیمز کو درمیان میں لیے دروازے کی طرف چلے تو جین تیزی سے سٹول چھوڑ کر ان کی طرف لپکی۔ "ٹھہرو۔ کیا تم مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جاؤ گے؟"

ان میں سے ٹاپ کوٹ والے آدمی نے اسے زور سے پیچھے دھکیلا اور وہ پھر سٹول پر آ گری۔ سٹول پنڈولم کی طرح آگے پیچھے جھولنے لگا تھا۔

وہ دوسری بار اٹھی اور انہیں دروازے کے قریب جا لیا۔ "ذرا ٹھہرو۔" اس نے استدعا کی۔ وہ جیمز کے مقابل ہوئی اور پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے پیوست کر دیئے۔ "اسے اپنے ساتھ لے جاؤ تاکہ تمہاری سمجھ میں آ سکے کہ ٹھیک اس وقت میں کیا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔"

"یہ کیا تھا؟ ونیلا؟" ایک سراغرساں نے استہزائیہ لہجے میں پوچھا اور پھر وہ سختی سے اسے اپنے درمیان لے کر باہر نکل گئے۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی بار پر پھر اپنی مخصوص جگہ آن بیٹھی۔ صرف بارمین گلاس پالش کرنے میں مصروف تھا۔

"وہ ایک رات کے لئے مجھ سے دور کیوں نہ رہ سکا؟" اس نے گریہ آلود آواز میں کہا اور بار پر جھک کر اپنا سر بازوؤں میں چھپا لیا۔ اب اس کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

"ذرا اور اونچی آواز میں رونے کی کوشش کرو' کیا تم ایسا کر سکتی ہو؟" بارمین نے بے تاب ہو کر کہا۔ "ہر شخص کی نظریں تم پر لگی ہوئی ہیں۔"

☆○☆

"یوں لگتا ہے آج کا دن خوشگوار رہے گا۔" جیمز نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس وقت کہا جب احاطے کا گیٹ ان کے لئے کھل گیا۔ احاطے کے اندر جیل کی عمارتوں کے تینوں بازو نیچے کی طرف اب تک تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ البتہ عمارت کے بالائی سرے سورج کی پہلی کرنوں کی وجہ سے پلاٹینم کی طرح دمک رہے تھے۔

وہاں دھندلکے میں آدمیوں کی دو مختصر سی قطاریں بے حس و حرکت کھڑی تھیں۔ یہ لوگ تعداد میں زیادہ سے زیادہ دس یا بارہ ہوں گے۔ شدید سردی کے باوجود وہ سب سر سے ننگے تھے۔

احاطے میں سب سے نمایاں چیز وہ پلیٹ فارم تھا جو نئے شہتیروں سے تعمیر کیا گیا تھا اور ان پر رنگ و روغن بھی نہیں کیا گیا تھا۔ یہ دھندلکے میں بھی سربلند کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ لکڑی کے ترشے ہوئے چھلکے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔

لکڑی کے دو عمدہ کھمبے سپیدہ سحر کے پیش منظر میں صاف نظر آ رہے تھے۔

"یہ چیز تیار کرنے کے لئے گذشتہ رات ان لوگوں کو خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑا ہو گا۔" جیمز نے کہا۔ "مجھے اپنی تو کوئی تشویش نہیں لیکن یہ بے چارے رات بھر یہاں جاگتے رہے ہوں گے۔"

اس نے تماشائیوں پر ایک حقارت آمیز نظر ڈالی۔ "یہ لوگ جو اتنی صبح بستروں سے نکل آئے ہیں اور وہ بھی ایک آدمی کا سر قلم ہوتا دیکھنے کے لئے' احمق ہیں۔"

وہ اور اس کے محافظ اندرونی دروازے سے چلتے ہوئے پلیٹ فارم کے قریب پہنچ گئے۔ وہ پلیٹ فارم کو نیچے سے اوپر تک توصیف آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔

"بیس زینے۔" وہ بولا۔ "بہت زینے ہیں۔ میں اتنا اوپر چڑھنا پسند نہیں کرتا۔ وہ ان کی تعداد کم کیوں نہیں کر دیتے؟"

"کیا تم کچھ کہنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

جیمز ناظرین کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "یہیں کھڑے رہنا۔ اوپر جانے کے مقابلے میں میرا نیچے آنے کا منظر زیادہ دلچسپ ہو گا۔"

اس کی بلند حوصلگی پر لوگ مبہوت رہ گئے اور زور زور سے سانس کھینچنے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ لوگوں میں بے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ جیمز نے پشت ان کی طرف کر دی۔ دونوں جانب کے محافظوں نے اوپر چڑھنے میں مدد دینے کے لئے اس کی کہنیوں کو سہارا دیا۔

"بس ٹھیک ہے۔" جیمز نے کہا۔ "میں خود ہی اوپر چڑھ سکتا ہوں۔"

اس نے بایاں پاؤں اٹھایا اور پہلے چوبی زینے پر رکھ دیا۔ پھر دایاں پاؤں اگلے زینے پر رکھا۔

☆○☆

جیمز نے کوٹھڑی کی کھڑکی کے دونوں سروں کی سلاخوں کے گرد کہنیاں ڈال رکھی تھیں اور درمیان کی سلاخوں کے درمیان دونوں ہاتھ اکٹھے کر کے ان پر بڑی بیزاری سے اپنی ٹھوڑی ٹکا رکھی تھی۔

اس کے پیچھے آہنی دروازہ چرچرا کر کھلا۔

"کیا تمہاری ملاقات کا وقت مقرر ہے؟" جیمز پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر غرایا۔

"پانچ منٹ۔ ٹھیک ہے ناں۔" محافظ نے کسی سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

دروازہ پھر بند ہو گیا اور باہر پختہ راہداری میں اس کے قدموں کی آواز بتدریج معدوم ہوتی چلی گئی۔

جیمز جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کوٹھڑی میں اس وقت کوئی اور بھی موجود ہے۔ اس کے باوجود اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ دو سفید' نازک مخروطی ہاتھ اس کے کندھوں سے سرکتے ہوئے اس کے گرد حمائل ہو گئے۔ ایک جانی پہچانی مسحور کن خوشبو نے اس کے سانسوں کو معطر کر دیا اور ریشمی ملائم بال اس کی گردن کو سہلانے لگے۔ اس نے حرکت نہ کی۔ اس کی آنکھیں شدت کرب سے انگاروں کی طرح دہکنے لگی تھیں۔ یکایک وہ وحشیانہ انداز میں تڑپا۔ بازوؤں کی گرفت چھوٹ گئی اور وہ بری طرح لڑکھڑاتی ہوئی الٹے قدموں بازو کی دیوار سے جا ٹکرائی۔

اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ یقیناً" اسے چوٹ لگی تھی لیکن اس کی خاموشی اس امر کی آئینہ دار تھی کہ اس نے اس بہیمانہ سلوک کا برا نہیں منایا۔ اور وہ اسے معاف کر چکی ہے۔ ہیرے کی انگوٹھی اور گلہری کے فر والا کوٹ اب اس کے پاس نہیں تھے۔ اس وقت وہ سرتاپا سیاہ کپڑوں میں ملبوس تھی۔

"تم یہاں کس لئے آئی ہو؟" وہ غرایا۔ "کیا یہ دیکھنے کے لئے کہ میرے منہ میں سونے کا کوئی دانت تو نہیں رہ گیا۔ جسے تم نظرانداز کر گئی ہو۔ اپنا اطمینان اس وقت کر لینا جب میرا سر کٹ کر بالٹی میں گر پڑے گا۔ ڈائن کہیں کی۔"

وہ خاموش کھڑی اسے ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر بولی۔ "تم سے ملاقات ہونے سے قبل میں واقعی ایسی تھی۔"

"مجھ سے ملاقات ہونے تک؟ تمہارا مطلب ہے کہ تم نے اب تک کوئی اور شکار نہیں پھانسا؟ اب جواب میں یہ مت کہنا کہ تم نازو ادا اور عشوہ طرازیاں بھول چکی ہو۔"

"تم اندھے ہو۔ میں تم سے تحفے لیتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے لیکن اس لئے نہیں کہ

وہ چیزیں قیمتی تھیں بلکہ اس لئے لیتی تھی کہ ان کا تعلق تم سے تھا۔"

اس نے جین کے سراپا کا جائزہ لیا۔ "تم نے یہ حالت کیا بنا رکھی ہے۔ کیا سب کچھ ریس میں لٹا چکی ہو؟ یا موت کی کوٹھڑی کے دیدار کی غرض سے خاص بہروپ بھر کے آئی ہو؟"

"وہ سب چیزیں میں نے "ہمارے" وکیل کو معاوضہ دینے کی غرض سے بیچ دیں۔"

اس کے چہرے پر پہلی بار تبدیلی کے آثار ہویدا ہوئے۔ "کہیں تم مذاق تو نہیں کر رہیں۔ میں تو سمجھا تھا اسے ٹریبونل نے مقرر کیا ہے۔"

"میں محض اتفاقات پر تکیہ کرنے سے ڈرتی تھی۔ اس کا انجام عموماً اچھا نہیں ہوتا۔"

وہ اس کے قریب پہنچا اور اسے الجھی الجھی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ "تم پر کیا بھوت سوار ہو گیا ہے؟"

"میں محبت میں گرفتار ہوں۔ محبت کا بھوت سوار ہے مجھ پر۔" اس نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

اس نے سر کو جنبش دی۔ "اف۔ غریب عورت۔ کوئی دو ہفتے بعد تمہیں اپنے ہاتھ پر ایک ایسے آدمی کا بوجھ لینا پڑے گا جس کا سر قلم ہو چکا ہو گا۔"

اتنے میں گارڈ آ پہنچا۔ اس نے سلاخوں میں سے اپنا سر ہلایا۔ وہ پیچ و تاب کھا کر اس کی طرف پلٹی اور اپنے اصل رنگ میں غرائی۔ "دور ہو جاؤ یہاں سے۔ نوٹوں کی گڈی جو میں نے تمہاری جیب میں ڈالی ہے وہ کم از کم مزید دس منٹ کے لئے کافی ہے۔"

گارڈ بڑبڑاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ "اس جرم کی پاداش میں میری ملازمت ختم ہو سکتی ہے۔ یہ قانون کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔"

وہ پلٹ کر پھر جیمز کی طرف متوجہ ہوئی اور اس کی قیدیوں والی قمیض کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر بولی۔

"میں تمہیں نہیں مرنے دوں گی۔"

"کوشش کر دیکھو۔ روک لو مجھے۔" اس نے بڑی بے اعتنائی سے جواب دیا۔

"مجھے آج تک اپنے مقصد میں ہار نہیں ہوئی۔ کوئی نہ کوئی راستہ نکلے گا۔ میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گی۔"

"ممکن ہے پریذیڈنٹ تک رسائی حاصل کر سکو۔"

جین کو اس بات پر کانپنے کی مہلت بھی نہ مل سکی۔ "اف۔ ٹریبونل نے تمہیں مجرم گردانا ہے۔ یہی ایک ٹریبونل ہے جو تمہاری سزا میں کوئی تبدیلی کرنے کا مجاز ہے۔ تبدیلی کا مطلب ہے سزائے عمر قید اور اس کا مطلب ہے ڈیولز آئی لینڈ۔"

"نہیں شکریہ۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میں موت کی جانب مختصر راستے کو ہی ترجیح دوں گا۔"

"لیکن اس صورت میں کسی وقت سزا معاف ہو جانے کا امکان بھی رہتا ہے جیمز۔ کن بنیادوں پر وہ معافی کے احکام صادر کر سکتا ہے؟ میری مدد کرو، اس بارے میں تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔"

"صرف اس صورت میں جب یہ ثابت ہو جائے کہ مجرم کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔"

"اس سے بھی کچھ فائدہ نہیں ہو گا۔ کیونکہ انہوں نے مقدمے کی ساعت میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ وکیل نے مجھے بتایا تھا کہ کوشش بیسود ہو گی۔ اور کچھ؟"

"اگر عوام کی ہمدردیاں تسلی بخش طور پر مجرم کے حق میں ابھاری جائیں اور وہ زوروشور سے اس کی رہائی کے لئے باقاعدہ مہم شروع کر دیں تو کام بن سکتا ہے۔"

"یہ کوشش بھی ناکام رہے گی۔ ہم رسوائے زمانہ عیاش ہیں۔ ہمارا ریکارڈ بھی بہت لمبا ہے۔ اور بس؟ کیا رہائی کے لئے یہی تدابیر اختیار کی جا سکتی تھیں؟"

"صرف ایک اور ترکیب ہے جو ابھی ابھی میرے ذہن میں آئی ہے۔" جیمز نے کندھے اچکائے۔ "شاذونادر کبھی سرکاری جلاد مر جائے تو قدیم روایت کے مطابق اس آدمی کی سزائے موت معاف کر دی جاتی ہے جس کا سر قلم ہونے کی

باری ہوتی ہے لیکن یہ معاملہ اتنا امید افزا نہیں۔ ایسا واقعہ چالیس پچاس برسوں میں ہی رونما ہوا کرتا ہے۔ یہ کمبخت بڑی لمبی عمر پاتے ہیں۔"

جین نے اس کی قمیص چھوڑ دی اور آہستہ سے ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سختی پیدا ہو گئی تھی۔ "تو پھر یہ شخص کبھی ایسا نہیں کر سکے گا۔" اس نے بلند آہنگ سرگوشی کے انداز میں کہا۔ وہ اسے خالی خالی نگاہوں سے دیکھتا رہ گیا۔ جین زبان سے ایک لفظ کہے بغیر دروازے کے پاس آئی اور اس کی سلاخوں پر اس اضطراب سے ہاتھ مارنے لگی جیسے وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی ہو۔

"جین۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "اب تمہارے دماغ میں کیا سودا سمایا ہے۔ کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ ایک منٹ کے لئے واپس آؤ اور میری بات سنو۔"

اس نے کندھا جھٹک کر جیمز کا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا۔ "میں تمہاری سزائے موت معاف کرانے جا رہی ہوں جیمز۔ اب مجھ سے کچھ مت پوچھنا۔ وہ تیغہ --- وہ بلیڈ جس پر تمہارا نام لکھا ہے کبھی تمہاری گردن پر نہیں گرے گا۔"

☆○☆

دایاں پاؤں' نواں زینہ' بایاں پاؤں دسواں زینہ دایاں پاؤں گیارھواں زینہ۔

جیمز کی آنکھیں اب قتل گاہ کے چبوترے کی بنیاد کے متوازی تھیں۔ اسے بالٹی دکھائی دے رہی تھی جس میں لکڑی کا برادہ اور باریک تراشے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے اس چیز کو زور سے ہلایا جو اس میں کٹ کر گرنے والی تھی۔ اس کا سر۔ اس نے اس انداز میں سر ہلایا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ نہیں نہیں۔ یہ سر اس بالٹی میں نہیں گرے گا۔

اس نے آلہ قتل کے نچلے حصے کو دیکھا جس میں نیم دائرے کی شکل کا نشتر لگا ہوا تھا۔ اس سے کئی فٹ اوپر دونوں کھمبوں کے درمیان آلے کا بالائی حصہ نظر آ رہا تھا جو نیم دائرے کی شکل میں ہی کٹا ہوا تھا۔ اسے نیچے گر کر نچلے حصے سے ملنا تھا اور یوں ایک مکمل دائرہ تشکیل پا جاتا اور اس کی گردن کو اس دائرے کے اندر

جکڑا جاتا تھا۔

اس نے اپنے گرد و پیش پاؤں دیکھے لیکن اس نے ان کے اوپر چہروں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی زحمت نہ کی۔ ابھی وہ وہاں نہیں تھا اور یہی بات اہمیت رکھتی تھی۔ دو چیزیں اور بھی وہاں نہیں تھیں ایک جلاد اور دوسرا بلیڈ۔

بایاں پاؤں' بارھواں زینہ۔ دایاں پاؤں تیرھواں۔ اور --- نہیں۔ میں اس پر قدم نہیں رکھوں گا۔ یہ تیرھواں زینہ ہے۔ اس کا پاؤں اٹھا کر اٹھا رہ گیا۔ پھر اس نے طاقت صرف کر کے تیرھویں زینے کے اوپر سے' اسے چھوئے بغیر پاؤں گزارا اور چودھویں پر رکھ دیا اور ایک جھٹکے سے اوپر چڑھ گیا۔ اس کی اس حرکت نے محافظوں کے چڑھنے کی رفتار میں تھوڑا سا خلل پیدا کر دیا کیونکہ وہ ان سے ایک قدم اوپر چلا گیا تھا۔ انہیں کیا معلوم کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی ہے۔ وہ زینوں کو شمار نہیں کر رہے تھے۔ اس لئے تیرھویں زینے پر قدم رکھ کر تیزی سے اس کے برابر جا پہنچے۔

انہوں نے جیمز سے کچھ نہ کہا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس وقت لازمی طور پر وہ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ ان کی زندگی کا پہلا تجربہ ہے کہ سزائے موت کے کسی قیدی نے قتل گاہ تک پہنچنے کے لئے بیک وقت دو زینے طے کیے ہوں۔ ممکن ہے یہ سوچ رہے ہوں کہ اس نے یہ حرکت اس لئے کی ہے کہ جلاد کی آمد سے قبل آلہ قتل کے قریب پہنچ جائے تاکہ اس کا انتظار کرے۔

بایاں پاؤں' پندرھواں زینہ۔ دایاں پاؤں' سولھواں زینہ۔

☆○☆

یہ بغلی گلی میں غیر معروف چھوٹا سا کیفے تھا جہاں ہر شب جانے پہچانے چہرے ہی دکھائی دیتے تھے۔ وہ چہرے پر پاکیزگی اور تقدس کے تاثرات لئے کیفے میں داخل ہوئی۔ اس نے سر پر سیاہ رنگ کا ایک رومال باندھ رکھا تھا اور اس کی بغل میں خون کی طرح سرخ کارنیشن پھولوں کی ٹوکری دبی ہوئی تھی۔

وہ آہستہ روی کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتی جا رہی تھی۔ "کارنیشن۔ پانچ کے عوض دو۔ کارنیشن؟" کسی نے پھول نہ خریدے

کیونکہ وہ اس حد تک سرخ تھے کہ کسی کے ذوق کے مطابق نہیں تھے۔ شطرنج بازوں' اخبار بینوں' سیاسی مبصروں' کسی نے بھی نظر بھر کر اس کی طرف نہ دیکھا کیونکہ کیفے میں وہ اجنبی تھی اور یوں لگتا تھا کہ اس کیفے کو اس نے کسی خاص مقصد کے تحت آمدورفت کا ہدف بنایا ہے۔ کسی نے اب تک اس کے پھول بکتے نہیں دیکھے تھے۔ یہاں تک کہ ایک ویٹر نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے کہہ ہی دیا۔ "اب اس دھندے سے دست بردار ہو گی بھی یا نہیں۔"

اس دور افتادہ گوشے میں ایک اخبار' ریڈنگ سٹک پر حسب معمول پڑا تھا۔ وہ اخبار بھی ہر رات اس جگہ پر نظر آتا تھا۔ بعض اوقات اس کے نیچے میز پر بلیک کافی کا کپ پڑا ہوتا اور بعض اوقات ایک پتلا اور خوبصورت ہاتھ اخبار کے نیچے دکھائی دیتا۔

جب وہ اس کے قریب پہنچی تو اخبار کے پیچھے سے یہی آواز سنائی دیتی۔

"میرے پاس پہلے سے ہی موجود ہے۔ شکریہ۔"

آج اس نے پھر قسمت آزمائی کی ٹھانی اور وہی آواز لگائی۔ "کارنیشن؟" وہ اس کے قریب جم کر کھڑی ہو گئی۔ "پانچ کے عوض دو۔ اس قدر سرخ پھول آپ نے کبھی نہیں دیکھے ہوں گے۔"

دفعتاً" اخبار نیچے کی جانب سرکا اور اس کے پیچھے ایک دلکش' چہرہ نمودار ہوا۔ یہ اٹھاون یا ساٹھ سال کے ایک شریف النفس اور خیراندیش شخص کا چہرہ تھا۔ اس چہرے پر کینگی کی خفیف سی علامت بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ ہلکی نیلی آنکھوں میں ایک بچے کی سی معصومیت جھلک رہی تھی اور اس نے سٹیل کے فریم والا چشمہ لگا رکھا تھا۔

"اوہ معاف کیجئے۔ آپ کے پاس واقعی ایک پھول موجود ہے۔" وہ معذرت آمیز لہجے میں بولی۔

اس نے پھول کالر سے دھیرے سے نکالا۔ اسے دیکھا اور پھر اس کے پھولوں پر نظر ڈالی۔ گذشتہ کسی رات بھی اس نے اس کے غیر معمولی رنگت کے پھول ضرور دیکھ لئے ہوں گے۔ خواہ اپنے اخبار کے کسی سوراخ کے راستے ہی کیوں نہ دیکھے

ہوں' لیکن آج رات تجسس یا پیشہ وارانہ رشک و حسد نے اس پر غلبہ پا لیا تھا۔

"میرا خیال تھا کہ پورے قصبے میں میرا پھول سب سے زیادہ سرخ ہے لیکن آپ کے پھول تو اس سے بھی کہیں زیادہ سرخ ہیں۔ کیا آپ بتانے کی زحمت گوارا کریں گی کہ آپ نے یہ کہاں سے حاصل کئے؟"

"میں انہیں خود کاشت کرتی ہوں۔" جین نے متانت لیکن قدرے شرگیں انداز میں جواب دیا۔

اس کا چہرہ دلچسپی کے احساسات سے دمک اٹھا۔ "ایک منٹ کے لئے بیٹھ جائیں۔ میں بھی اپنے پھول خود --- صرف یہی ایک مشغلہ ہے قابل ذکر۔ کیا چیز پیدا کی ہے آپ نے۔ دیکھنے میں غالباً" مصنوعی ہی لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ قطعی طور پر اصلی پھول ہیں کیونکہ انہیں چھوکر اس کا یقین کیا جا سکتا ہے۔ یہ کارنامہ آپ نے کیسے انجام دیا؟ آپ کون سے بیج استعمال کرتی ہیں؟ کونسی مٹی میں انہیں بوتی ہیں؟"

پوری گفتگو یکطرفہ طور پر ہوتی رہی۔ اسے اس موضوع پر تکنیکی معلومات حاصل نہیں تھیں۔ پھولوں کے بارے میں اس نے ایک کتاب کا سرسری سا مطالعہ کیا تھا۔ اسے تھوڑی بہت معلومات جو حاصل ہوئی تھیں انہیں استعمال کرنے کا اسے موقع نہ مل سکا۔ وہ بے تکان بول رہا تھا اور وہ گاہے گاہے اس قسم کے جملے ادا کرنے پر اکتفا کرتی۔ "میں بھی ایسا کرتی ہوں۔" یا "یہی کچھ میں بھی کرتی ہوں۔"

وہ تنہائی کا مارا ہوا پر مغز بوڑھا تھا اور اپنے پسندیدہ مشغلے پر سیر حاصل گفتگو کرنے کا بھوکا۔

"اچھا تو آپ نے یہ بیج فارمنڈی سے حاصل کئے۔ اپنے عزیز و اقارب سے۔ میں انہیں اپنے باغ میں اگا کر خوشی محسوس کروں گا۔"

"میں کچھ بیج آپ کو فراہم کر دوں گی۔ آپ مجھے کہاں مل سکیں گے؟"

وہ خوشی سے بے خبر ہو رہا تھا۔ زندگی بھر کی احتیاط موم کی طرح پگھل گئی اور اس نے اپنا پتہ بتا دیا۔

"کیا جمعرات کا دن موزوں رہے گا؟" اس نے پوچھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جمعرات کا دن کونسا دن ہے۔

اس نے نظریں جھکا لیں۔ "نہیں اس روز میں نے کسی کو علی الصباح ملاقات کا ٹائم دے رکھا ہے۔"

"تو پھر بدھ کی شام کو سہی۔"

"آپ بھول تو نہیں جائیں گی؟" اس نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔

جین نے اسے پلکوں کے نیچے سے میٹھی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "غالباً" نہیں بھولوں گی موسیو۔"

ویٹر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے باہر کا راستہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "جانتی ہو جس سے تم باتیں کر رہی تھیں' کون ہے؟"

"کون ہے؟"

"سرکاری جلاد۔ یہاں اور کسی کو مت بتانا ورنہ ہمارے گاہک دہشت زدہ ہو کر بھاگ جائیں گے۔ وہ ہر رات پابندی سے یہاں آتا ہے۔"

اس نے خوفزدہ ہونے کی اداکاری کی۔ اگرچہ اداکاری بودی تھی مگر ویٹر کو مطمئن کرنے کے لئے کافی تھی۔

☆O☆

اس کا دایاں پاؤں اب پلیٹ فارم پر رکھا تھا۔ اس کا دوسرا پاؤں ہولے ہولے گھسٹتا ہوا بیسویں اور آخری زینے سے الگ ہوا اور دوسرے پاؤں کے قریب آن ٹکا۔

نیچے احاطہ اب تک اندھیرے کے کمبل میں لپٹا ہوا تھا لیکن اس کے گردوپیش جیل کی عمارتوں کے بالائی حصے دن کی روشنی سے سفید ہو چکے تھے۔ نیچے کھڑے لوگوں کے چہرے جو اوپر کی جانب اٹھے ہوئے تھے' اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ محافظ جو اسے یہاں تک لائے تھے اب اسے گھما کر ان دو اونچے کھمبوں کی طرف لے جا رہے تھے۔ یہ کھمبے اب تک بے ضرر تھے۔ وہ اسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے تھے۔ کیونکہ ان کے درمیان ابھی بلیڈ نصب نہیں کیا گیا تھا۔

ابھی جلاد بھی وارد نہیں ہوا تھا۔ انہیں اتنی جلدی جیمز کو یہاں نہیں لانا چاہیے تھا۔ مگر اس کے نمودار ہونے سے قبل ہر چیز بالکل تیار رہنا چاہیے تھی۔ کسی نے معاملہ کچھ گڑبڑ کر دیا تھا۔ انہیں اس بات کا پختہ یقین تھا کہ جو شخص گذشتہ چالیس سال میں ایک بار بھی جائے مقررہ پر تاخیر سے نہ پہنچا تھا۔ آج بھی مجرم کے پلیٹ فارم پر پہنچتے ہی آ دھمکے گا۔ تاخیر کے نتیجے میں سکینڈل بھی کھڑا ہو سکتا تھا۔ "غیر ضروری ظلم" ---اسی بنیاد پر اس کی سزائے موت بھی منسوخ ہو سکتی تھی۔

اب وہ موت کی مشین کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے دونوں کھمبوں کے درمیان سے ٹکٹکی لگا کر گیٹ کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ جلاد کو اسی دروازے سے داخل ہونا تھا لیکن وہ نہیں آیا تھا۔ مسلح محافظوں کا ایک جوڑا گیٹ پر اس کا منتظر تھا اور اس کی آمد پر دروازہ کھولنے کے لئے مستعد تھا۔ وہ لمحہ جو کبھی نہیں آنا تھا۔

☆O☆

میز کے کنارے پڑا ایک سگریٹ سلگ رہا تھا۔ دیوار پر ایک کیلنڈر آویزاں تھا۔ ماہ رواں کے پہلے تیس دن ایک کے بعد ایک قلمزد کر دیئے گئے تھے۔ ان کے آگے خالی تاریخ کا ایک خانہ ابھی باقی تھا۔ اس کے بعد نیل کی ایک بہت بڑی سرخ آنکھ آئی تھی جو مہینے کے چھبیسوں دن کے خانے میں بنی ہوئی تھی۔ آخری خالی خانے کے سترہ گھنٹے ماضی کی جانب سرک چکے تھے۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ جین تاخیر ہی کرنا چاہتی تھی تاکہ جلاد کے پاس رات کے کھانے کے وقت پہنچ سکے۔

اس نے لمبی سی پن پکڑی اور ایک ایک لال بیگ کو ان کی پشت کے بل الٹتی گئی۔ سب کے سب زندگی سے محروم اور اکڑے ہوئے تھے اور اس قدر سخت ہو گئے تھے جیسے کافی کے بیج۔ یہ مادہ جو کچھ بھی تھا لازمی طور پر اثر انگیز تھا۔

یہ ایک چھوٹی سی ڈبیہ میں بند تھا۔ یہ بالکل ان ڈبیوں کی مانند تھی جن میں عموماً "پسی ہوئی سیاہ مرچیں' مصالحے وغیرہ پیک کئے جاتے ہیں۔ یہ مادہ گہرے رنگ کا تھا۔ اس نے تھوڑا سا اس اخبار پر چھڑکا جس پر مردہ کیڑے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے احتیاط سے اپنا چہرہ اس کے قریب کیا۔ کسی طرح کی بو نہیں تھی اور جہاں تک ذائقے کا تعلق تھا۔ "یہ میٹھا ہے۔ یہ انہیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔" ڈرگ

کلرک نے اسے یقین دلایا تھا۔ "میں اس کے موثر ہونے کی گارنٹی دیتا ہوں' لیکن خیال رہے کہ اس کے آس پاس بچے نہ آئیں کیونکہ یہ انتہائی مہلک ہے۔"

"میرے ہاں کوئی بچہ نہیں۔" اس نے پراسرار مسکراہٹ سے جواب دیا۔

لال بیگ اس زہر سے دس یا پندرہ منٹ میں متاثر ہوئے تھے۔ اس نے وقت کا خاص خیال رکھا تھا لیکن بہرحال وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ حقیقتاً" کب مرے۔ تاہم انسان پر تو یہ ذرا دیر میں اثر کرے گا۔ اسے دگنی' نہیں تین گنا خوراک دینا چاہیے۔ پینتالیس منٹ میں زہر کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہوں گے۔ حد ہو گئی۔ وہ کوئی ماہر زہریات تو نہیں تھی۔ محبت کی متوالی ایک عورت تھی اور بس۔

"بہرکیف رات کے دوران کچھ نہ کچھ اثر تو ہو گا۔" وہ باآواز بلند بڑبڑائی۔

"اس کا انحصار اس پر ہے کہ تم اسے کتنی مقدار میں زہر کھلاتی ہو۔" اس معاملے میں تو وہ پوری شیشی کھلا دینے کے حق میں تھی۔ وہ سزائے موت کو ملتوی نہیں کرنا چاہتی تھی بلکہ اسے منسوخ کرانے کا عزم کئے ہوئے تھی اور پھر وہ جوان بھی تو نہیں تھا کہ اسے برداشت کر سکتا۔

اس نے سوچا اگر اسے زہر نے زیادہ تکلیف پہنچائی تو کیا ہو گا؟ بے شک بیہوش یا مفلوج ہونے سے پہلے یہ اسے بے حد اذیت پہنچائے گا۔ درد تو برداشت نہیں ہو سکے گا۔ اگر بروقت معدے کا پمپ استعمال کیا گیا یا کوئی سریع الاثر تریاق دے دیا گیا تو اس کی جان بچ جائے گی مگر غالباً" وہ بروقت نہیں سمجھ پائے گا کہ اسے ہوا کیا ہے؟ پہلے تو یہی سمجھے گا کہ بدہضمی کی شکایت ہے' پھر مروڑ کا خیال آئے گا اور آخر میں اپنڈے سائی ٹس --- اور اس وقت تک اس کا علاج ممکن نہیں رہے گا۔ یہ زہر کسی ایسی چیز میں ملانا چاہیے جس میں اس کی مٹھاس محسوس نہ ہو سکے' ورنہ وہ ضروری خوراک حلق میں اتارنے سے پہلے ہی چوکنا ہو کر اسے رد کر دے گا۔

اس نے ڈبیہ کے گرد ایک جیبی رومال لپیٹا لیکن پہلے اس نے اطمینان کر لیا کہ ڈبیہ کے ڈھکنے میں چھوٹے چھوٹے سوراخ کھلے تو نہیں رہ گئے۔ اس نے انہیں دھات کے بالائی ڈھکنے سے اچھی طرح ڈھانپ دیا۔ پھر اس نے ڈبیہ کو کوٹ سویٹر

کی جیب میں ڈال لیا جو اس وقت وہ پہنے ہوئے تھی۔ ہینڈ بیگ کی نسبت وہ جیب سے باآسانی حاصل کی جا سکتی تھی۔ اس نے ڈبیہ کا لیبل بھی اتار دیا اور ڈھکنے کو بھی اتنا ڈھیلا کر دیا کہ ضرورت کے وقت فوری طور پر اتارا جا سکے۔

اس نے وہ چھوٹا سا لفافہ اٹھایا جس میں کارنیشن کے بیج تھے۔ وہ یہ بیج سستے داموں بازار سے خرید کر لائی تھی۔ بیج عام سفید پھولوں کے تھے لیکن وہ انہیں بونے اور پھر پھولوں کا رنگ دیکھنے کے لئے زندہ کہاں رہنے والا تھا۔

اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی لیکن پھر ایک منٹ کے لئے اندر داخل ہوئی اور پنسل لے کر کیلنڈر پر تاریخ کا آخری خانہ بھی کاٹ دیا۔ اب سارے کے سارے خانے کٹ چکے تھے۔ بیل کی آنکھ تمام کے تمام خانے۔ جب اس نے باہر نکل کر دروازہ بند کیا تو اس کا چہرہ خوبصورت لگ رہا تھا۔

☆○☆

جیل کے احاطے کی تین سمتوں میں سلاخوں والی ہر کھڑکی کے پیچھے ایک قیدی کا دھندلا سا ہیولا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ لوگ بالکل ساکت و جامد کھڑے تھے۔ خفیف سی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ جیل کی اچھی طرح آباد عمارتوں کے اوپر گہرا سکوت جنازے کی چادر کی مانند لگ رہا تھا۔ ان میں سے کچھ لوگ سزائے موت کا منظر دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ وہ لوگ جن کا خود ایک روز یہی انجام ہونے والا تھا لیکن وہ ان کوٹھڑیوں کی کھڑکیوں سے دور ہٹنے کے قابل بھی نہیں تھے۔

جیل کی تینوں سمتوں میں اسے کوٹھڑیوں کے دروازے پر قیدی کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ جنہوں نے اپنے سفید سفید ہاتھوں سے سلاخوں کو تھام رکھا تھا۔ انہیں یہ منظر دیکھنے کی اجازت دینا بھی ایک بربریت تھی۔ اس کے باوجود یہ ایک مہذب ملک کہلاتا تھا۔ موت کی سزا پانے والوں کو وہاں بجلی کے ذریعے موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے۔ انہیں اس طرح پلگ لگائے جاتے ہیں جیسے وہ زندہ لیمپ ہوں۔

اس نے فرض کر لیا کہ جیل کے حکام قیدیوں کو موت کا یہ بھیانک منظر اس لئے دیکھنے کی اجازت دیتے ہیں کہ انہیں عبرت حاصل ہو۔

اس نے پھر دونوں کھمبوں کے درمیان سے گیٹ کی طرف پلک جھپکائے بغیر دیکھنا شروع کر دیا۔ ماحول پر انتظار کی کیفیت طاری تھی۔

☆○☆

وہ ان پر اس طرح خوشی سے گنگنا رہا تھا جیسے ایک بچہ نیا کھلونا پا کر گنگناتا ہے۔ وہ اپنے کاٹج کے پیچھے باغ میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں پانی چھڑکنے کا فوارہ تھا اور اس نے دھوپ سے آنکھوں کو محفوظ رکھنے کے لئے سر پر پھٹا پرانا ہیٹ رکھا ہوا تھا۔ وہ پرانے سلیپر پہنے پھولوں کی کیاریوں کے درمیان گردش کر رہا تھا اور وہ تقریباً" چار سو آدمیوں کے سر قلم کر چکا تھا۔

"تم اندر آ رہے ہو یا چاہتے ہو کہ کھانا ٹھنڈا ہو جائے؟" کلماڑی کی شکل والی ہاؤس کیپر نے پچھلے دروازے سے صدا لگائی۔ اس کے لہجے سے ناپسندیدگی جھلک رہی تھی۔ اس کی ناپسندیدگی غالباً" اس کے کبھی ختم نہ ہونے والے پھولوں اور جین کی یہاں مداخلت' دونوں کے لئے تھی۔

"میں آپ کو ان بیجوں کی قیمت ادا کر دوں گا۔" جلاد نے جین سے کہا اور گھر کی عمارت کی طرف مڑا۔

"اوہ نہیں۔ میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی۔ آپ انہیں ایک تحفے کے طور پر قبول کر لیں۔"

"نہیں نہیں۔ میں ان کی قیمت ادا کرنا چاہتا ہوں۔ آخر آپ نے قصبے کے اس سرے سے اتنی دور میرے پاس آنے کی زحمت کی ہے۔ اس کے لئے میں آپ کی کوئی اور خدمت نہیں کر سکتا مگر بیجوں کی قیمت تو ادا کر سکتا ہوں۔"

جب جلاد نے عقبی دروازہ کھولا تو وہ بڑے شوق اور حسرت آمیز لہجے میں بولی۔ "آہا۔ کتنی اشتہا انگیز خوشبو ہے۔" حالانکہ اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے سکا تھا۔

"اوہ ہاں۔ کیوں نہیں۔ میں بھی کیسا بداخلاق ہوں۔ آپ کو یقیناً" بھوک لگ رہی ہو گی۔ کیا آپ ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہونا پسند کریں گی؟"

"ہمارے ساتھ؟" اس کا دل ڈوب گیا۔ تو کیا عقابی نگاہوں والی وہ بوڑھی

حرافہ اس کے ساتھ ہی کھانے کی میز پر بیٹھے گی۔ ان دونوں کی موجودگی میں تو وہ اپنا کام انجام نہیں دے سکے گی۔

"کہیں آپ دونوں کے لئے کھانا کم نہ پڑ جائے؟" اس نے عذر پیش کیا۔

"نان سنس۔" وہ اپنائیت آمیز لہجے میں بولا۔ "اب آپ اندر آ جائیں۔ اب میں جواب میں انکار سننا پسند نہیں کروں گا۔" پھر وہ بدہیئت بڑھیا سے مخاطب ہوا۔

"میں نے میڈم سے استدعا کی ہے کہ وہ ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوں۔"

"اچھا۔" بڑھیا نے بڑے خشک لہجے میں جواب دیا۔

جب وہ دونوں بڑھیا کے مقابل کرسیوں پر بیٹھ گئے تو جلاد نے اپنے پہلو میں بیٹھی جین سے سرگوشی کی۔ "اس پر کوئی توجہ نہ دینا۔ یہ شروع ہی سے بدمزاج تھی۔"

گردوپیش کا طائرانہ جائزہ لینے کے بعد اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس ہستی کی رہائش گاہ ہے۔ عام سا کاٹج تھا لیکن اندر سے خوب آراستہ و پرآسائش تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں چمچہ لئے سوپ پی رہی تھی اور نیچے گود میں رکھے دوسرے ہاتھ میں اس نے رومال میں لپٹی ہوئی زہر کی ڈبیہ پکڑ رکھی تھی۔

میز پر بیٹھنے کے بعد پہلی بار خاتون خانہ نے زبان کھولی اور اپنے شوہر سے اس انداز میں مخاطب ہوئی جیسے جین کو گفتگو میں شریک کرنے سے گریزاں ہو۔ "کیا آج سہ پہر تم منسٹری گئے تھے؟"

"گیا تھا۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔ اس کے چہرے پر کچھ اس طرح کے تاثرات نمایاں ہوئے جیسے یہ بات اسے گراں گزری ہو۔

جین جانتی تھی کہ منسٹری سے مراد "وزارت انصاف" ہے۔

جین نے شوربے کی گہرے ڈونگے کی طرف پرتفکر نظروں سے دیکھا لیکن شاید وہ مزید شوربہ پینے کے موڈ میں نہیں تھا اور ڈونگہ خاتون خانہ کی طرف پڑا تھا۔ وہ اس شوربے میں کسی طرح زہر نہیں ڈال سکتی تھی۔ کسی صورت بھی نہیں۔

"کیا تمہیں آرڈر اور کل کے اخراجات کے لئے رقم مل گئی ہے؟" بڑھیا نے پوچھا۔

"قدرتی سی بات ہے لیکن کیا اس موضوع پر بات کرنا اسی وقت ضروری ہے؟" وہ مضطرب ہو اٹھا اور دزدیدہ نظروں سے اپنی مہمان کی طرف دیکھا۔

آرڈر سے اس کی مراد "قتل کا حکم" تھی۔

"تم سے بات کرنے کا یہی تو ایک موقعہ ملتا ہے مجھے۔" بڑھیا قدرے بھنا کر بولی۔ "جب تک تم گھر رہتے ہو ہر وقت اپنے پھولوں میں الجھے رہتے ہو۔ ایک منٹ کی فرصت تو تمہیں ملتی نہیں ہے۔" اس کے ساتھ ہی وہ اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد ہاتھ میں ایک اور پکوان کی پلیٹ لئے آن وارد ہوئی۔ جین کا گود میں رکھا ہاتھ جو کچھ اوپر اٹھ چکا تھا' نیچے گر گیا۔ وہ اس ہاتھ کو ہولے ہولے اس طرح غیر محسوس انداز میں اوپر اٹھا رہی تھی کہ کسی کو اس کی حرکت کا شبہ تک نہ ہو سکے۔

"ہلکے گلابی رنگ کے کارنیشن بہت پسند کئے جاتے ہیں۔" جین نے جلاد کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ کیا کہہ رہی تھی۔ اس کا اسے مطلق علم نہ تھا۔ "سفید اور سرخ پھولوں کی اتنی مانگ نہیں۔"

اس کا ارغوانی رنگ کی شراب کا گلاس جین کی رسائی میں تھا۔ اگر وہ کسی طرح اسے دوسری جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اس گلاس میں زہر ڈال سکتی ہے۔ اس نے انگوٹھے کے ناخن سے ڈبیہ کے ڈھکن کو اتار دیا جو اسے اپنی گود میں گرتا محسوس ہوا۔ پھر اس نے ڈبیہ کو پھرتی سے اپنے سویٹر کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اس کی نگاہیں اب وقت جین کے کندھے سے اوپر گزرتی ہوئی اس کھڑکی کی جانب لگی ہوئی تھیں۔ یہ کھڑکی جلاد کے انتہائی بائیں جانب تھی۔ اگر وہ کھڑکی کی سمت دیکھنا چاہتا تو اسے خاصا مڑنا پڑتا۔

اور وہ بوڑھی لومڑی --- اسے بھی مخالف سمت یعنی دائیں جانب کھڑکی کی طرف متوجہ ہونا چاہیے تھا۔ اس کے باوجود اس کا تین چوتھائی چہرہ سامنے کی طرف ہی رہتا۔ اس تدبیر کی کامیابی غالباً" غیر یقینی تھی۔ پھر بھی وہ قسمت آزمائی کرنا ہی چاہتی تھی۔ کیونکہ وقت بہت کم رہ گیا تھا اور یہ موقع بھی پہلا اور آخری تھا۔

اس نے کھڑکی سے باہر نظریں جماویں اور اس کا چہرہ خوشی اور توصیف کے

جذبات سے دمکنے لگا۔ "آہا۔ دیکھئے غروب آفتاب کا یہ منظر کتنا دلکش ہے؟"

دونوں کے سر یکبارگی کھڑکی کی طرف مڑے۔ کا ہاتھ تیزی سے میز پر آیا' لیکن عین اسی لمحے اس کی نگاہیں بڑھیا کے چہرے پر پڑیں جس سے وہ کچھ زیادہ ہی خائف تھی۔ وہ نہ تو کھڑکی کی سمت دیکھ رہی تھی نہ جین کی طرف' بلکہ وہ جین کے پیچھے آئینہ موجود تھی جس میں نہ صرف باہر کا منظر بلکہ اس کی پشت بھی دکھائی دے رہی تھی۔

جین نے مایوس ہو کر ڈبیہ کو رومال سمیت پھر اپنی گود میں ڈال لیا اور دل ہی دل میں دعا کرنے لگی کہ ڈبیہ کسی کو دکھائی نہ دے گئی ہو۔

"شاندار منظر ہے۔" جلاد نے پیچھے مڑتے ہوئے تائید کی۔

"معمول کے مطابق ہے۔" بڑھیا نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔

جین نے لاپرواہی کے انداز میں گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ اس کی کرسی کے عین پیچھے دیوار کے ساتھ سائیڈ بورڈ کے اوپر ایک آئینہ نصب تھا جس کی طرف اس کی خفیف حرکت بھی آسانی سے دیکھی جا سکتی تھی۔ "اف یہ بڑھیا۔ کیا اس نے یہ سب کچھ ارادتاً" کیا تھا؟ کیا اسے کوئی شک ہو گیا تھا؟"

بڑھیا کمرے سے نکل گئی اور سیبوں کی ایک پلیٹ کے ساتھ واپس آئی۔ اس نے سب سیبوں کو یکے بعد دیگرے اپنے ایپرن سے صاف کیا اور پھر پلیٹ میں چن دیئے۔

"اوہ۔ تو اس کا مطلب ہے ہم میٹھے پین کیک نہیں کھائیں گے؟" جین نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"تمہیں کیسے خیال آیا کہ ہم وہ ضرور کھائیں گے؟" بڑھیا نے ترشروئی سے کہا۔

"کچھ نہیں۔ بس ویسے ہی۔ دراصل جب میں کچن سے گزری تھی تو وہاں میں نے ایک باؤل میں بسکٹ وغیرہ کا چورا بنا ہوا دیکھا تھا۔ میں نے سوچا۔"

"تم غلط سمجھیں۔ وہ چورا میں نے بسکٹ تیار کرنے کے لئے بنایا ہے۔ صبح موسیو ان سے ناشتہ کریں گے۔ میں یہ بسکٹ اپنے ہاتھ سے تیار کرتی ہوں۔"

"بعض اوقات میں صبح سویرے جاگ پڑتا ہوں۔" جلاد نے وضاحت کی۔
دراصل وہ بڑھیا کی بدکلامی کا اثر زائل کرنا چاہتا تھا۔ "اسوقت چورا وغیرہ تیار کرنے کا اسے وقت نہیں ملتا۔ لہٰذا یہ رات ہی میں مصالحہ وغیرہ تیار کرلیتی ہے۔"

اب میں جان گئی ہوں کہ بسکٹ کس کے معدے میں اتریں گے؟ جین نے دل میں باغ باغ ہوتے ہوئے سوچا۔ اب ذرا شیطان میری دستگیری کرے۔

"تم شام کو عموماً" کس وقت اپنے پھول فروخت کرنے نکلتی ہو؟" بڑھیا نے نوکیلے لہجے میں استفسار کیا۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے اسے شک ہو کہ جین درحقیقت اس سے کوئی بالکل مختلف کاروبار کرتی ہو۔

"عموماً" آٹھ بجے کے لگ بھگ۔ جب عام طور پر لوگ رات کا کھانا کھا کر کیفوں کا رخ کرتے ہیں۔ اب میں چند منٹ بعد ہی رخصت کی اجازت چاہوں گی۔"

"اتنی جلدی بھی کیا پڑی ہے میری بچی؟ بیٹھو اور کچھ دیر آرام کرو۔" بڑھیا نے بڑی عیارانہ شفقت سے کہا۔

عین اسی لمحے اطلاعی گھنٹی بجی اور باہر سے سیٹی بجنے کی آواز آئی۔ بڑھیا اچھل پڑی۔ "پوسٹ مین آگیا۔ یقیناً" میری بہن کا خط لایا ہو گا۔" وہ دروازے کی طرف بھاگی۔

اس کے ایک سیکنڈ بعد ہی جین بھی تیزی سے اٹھی۔ "کیا میں ایک گلاس پانی پی سکتی ہوں؟ مجھے سخت پیاس لگی ہے۔ آپ زحمت نہ کریں میں جانتی ہوں پانی کہاں سے مل سکتا ہے۔" دوسرے ہی لمحے وہ باورچی خانے میں اس باؤل کے اوپر جھکی کھڑی تھی جس میں بسکٹ کا کیچر رکھا تھا۔ اس نے ڈبیہ کا سارا زہر اس میں ڈال دیا اور لکڑی کے چمچے سے ہلا کر اسے اچھی طرح ملا دیا تاکہ زہر ایک ہی جگہ نہ پڑا رہے۔

جب وہ واپس اس کمرے میں آئی تو بڑھیا مخالف سمت کے دروازے میں کھڑی بڑے استغراق سے خط پڑھ رہی تھی اور خوشی سے اس کا چہرہ بیس سال پیچھے جوانی کی طرف لوٹ گیا تھا۔ آخر وہ چوک ہی گئی تھی۔ اس کی احتیاط دھری کی

دھری رہ گئی تھی۔ اسے احساس تک نہ ہو سکا تھا کہ اس کی مہمان میز سے اٹھ کر کہیں گئی تھی۔

"وہ کہتی ہے۔ مارتھا کے ہاں ایک اور بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ کہو تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں؟"

"موسیو۔ اب مجھے جانا چاہیے۔" جین نے دھیمے میٹھے لہجے میں کہا اور بڑی خوش ادائی سے اپنی پلکیں جھکا لیں۔ وہ اندر ہی اندر قہقہے لگا رہی تھی۔ اب یہ میرے جیمز تک پہنچنے سے بہت پہلے لقمہ اجل بن جائے گا۔

☆○☆

ایک کوٹھڑی کے دروازے سے یکایک آواز ابھری۔ "اسے نیچے لاؤ۔" آواز فضا میں یوں تڑپی تھی جیسے کوڑا کڑکڑایا ہو۔ اس کے بعد ماحول پر پھر وہی مرگ سا سکوت طاری ہو گیا۔ احاطے کی سمت سے آوازوں کا ایک شور اٹھا اور انہی الفاظ کو دہرانے لگا۔ آوازیں جیل کے درودیوار سے ٹکرا کر عجیب انداز میں گونج رہی تھیں۔

"اسے وہاں سے نیچے لاؤ۔ خدا کا خوف کرو ذلیل کتو۔"

"اسے صرف ایک بار قتل کیا جانا تھا۔ سو بار نہیں۔"

"جلاد غائب ہے۔ قتل نہیں ہو گا۔"

اس کے بعد یہ سب آوازیں ایک لفظ پر ہم آہنگ ہو کر گونجنے لگیں۔ "نیچے۔ نیچے۔ نیچے۔"

جیمز گلوٹین کے کھمبوں میں سے بدستور ٹکٹکی لگائے گیٹ کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اسے اب تک پلک جھپکانے کی فرصت نہیں ملی تھی۔

☆○☆

کاٹیج کے صدر دروازے سے صبح ٹھیک پونے پانچ بجے ایک آدمی برآمد ہوا۔ اس کے بٹن ہول میں خون کی طرح سرخ ایک کارنیشن ٹنکا ہوا تھا۔ ابھی گھپ اندھیرا تھا اور سٹریٹ لائیٹس روشن تھیں۔ اس کے دائیں ہاتھ میں نقشین پینٹ والی ایک آبنوسی چھڑی تھی اور بائیں ہاتھ میں اٹھائیس انچ لمبا اور نو انچ چوڑا ایک

چرمی بیگ تھا۔ اس کے مخملی گدے پر وہ چیز رکھی ہوئی تھی جس کا ایک کنارہ استرے کی طرح تیز تھا اور اس کا تعلق ان دو کھمبوں سے تھا جن کے درمیان جیمز کھڑا مسلسل دروازے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

وہ ایک آدمی تھا جو دوسرے عام آدمیوں کی طرح اپنے کام پر جا رہا تھا۔ وہ اب تک اپنے منہ کے ایک گوشے اور مونچھوں سے بسکٹ کے مہین ذرات صاف کر رہا تھا۔ اس نے بڑی جھنجلاہٹ سے سر جھٹکا اور بڑبڑایا۔ "اتنی مٹھاس۔ اس سے تو میرا دل جلنے لگے گا۔ معلوم ہوتا ہے اب وہ سٹھیا گئی ہے۔"

عین ادائیگی فرض کے دوران معدے میں کسی گڑ بڑ ہونے کے امکان نے اسے سخت فکرمند کر دیا۔ فرض کرو۔ سب لوگوں کے سامنے پلیٹ فارم پر اسے وحشت ناک ہچکیاں شروع ہو جائیں یا قے آنے لگے تو کیا پرلطف منظر ہو گا۔ ہے ناں؟ موت تو ایک خاص احترام اور توقیر کی متقاضی ہوتی ہے۔ کمتر سے کمتر مجرم کی زندگی کے آخری لمحات بھی احترام کے مستحق ہوتے ہیں۔

وہ کاٹج سے پیدل چلتا ہوا زیرزمین ریلوے لائن کے آخری سٹیشن پر پہنچا۔ زینے سے اترا۔ چینج بوتھ پر سیکنڈ کلاس کا ایک ٹکٹ خریدا اور بیگ ہاتھ میں لئے بیریئر کے پیچھے ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ منہ اندھیرے کام پر جانے والے کچھ مزدور اس کے آس پاس جمع ہونے لگے۔ پہلی ٹرین آئی۔ بیریئر اوپر اٹھ گیا اور وہ اندر داخل ہو گیا۔ صبح کے اس وقت بہت سی نشستیں خالی پڑی تھیں۔ وہ ایک دور افتادہ گوشے میں بیٹھ گیا اور بیگ کو فرش پر رکھنے کی بجائے احتیاط سے اپنے گھٹنوں پر رکھ کر دونوں ہاتھ چھتری کے ہتھے پر جما دیئے۔

وہ نروس نہیں تھا۔ جو کام وہ کرنے جا رہا تھا' وہ گزشتہ چالیس برس سے انجام دیتا آ رہا تھا اور اس سے پہلے اس کا باپ کر رہا تھا۔ یہ ان کا پیشہ تھا۔ آبائی پیشہ۔ یہ ایک کام تھا جو اسے لازمی طور پر انجام دینا تھا اور پورے فرانس میں وہ اور صرف وہ یہ کام کرنے کا قانونی استحقاق رکھتا تھا۔ پورے ملک میں قانون جس فرد کی بھی جان لیتا تھا' اس شخص کے ہاتھوں سے لیتا تھا۔ چار کروڑ افراد کا حکم بجا لانے والا وہ اور صرف وہ واحد نمائندہ تھا۔ وہ آئے دن سفر پر رہتا تھا اور ملک کے طول و عرض

میں ہر شہر اور بڑے قصبے میں گاہے بگاہے نظر آتا رہتا تھا اور آج کی منزل زیادہ دور نہیں تھی۔ صرف شہر سے باہر آدھ گھنٹے کا سفر تھا۔

اس نے حواس کو بجا رکھنے کے لئے کمپارٹمنٹ کی چھت کے ساتھ لگے ہوئے مختلف اشتہارات پڑھنا شروع کر دیئے۔ گاڑی تیزی سے منزل کی طرف جا رہی تھی۔ اب اسے اپنے معدے میں خاصی گرانی محسوس ہونے لگی تھی۔ ممکن ہے زمین دوز راستے کی کثیف ہوا میری طبیعت پر اثر انداز ہو رہی ہو۔ ہاں یہی بات ہے۔ اس نے سوچا۔ پھر خیال آیا کہ کہیں ضرورت سے زیادہ کھا لینے کی وجہ سے تو یہ گڑبڑ نہیں ہوئی؟ اسے وہ آخری پلیٹ لینے سے انکار کر دینا چاہیے تھا۔ لیکن میں ڈرتا تھا کہ کہیں وہ برا نہ مان جائے۔ اگر میں برتن میں تھوڑا سا کھانا چھوڑ دوں تو وہ اسے اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیتی ہے۔

اس نے اپنی پرانے فیشن کی گھڑی دیکھی۔ اگر وہ ذرا پھرتی سے کام لے تو اتر کر اپنے پیٹ کی حالت کو سنبھالنے کے لئے کافی کا ایک کپ پی سکتا ہے۔ اس نے جلاد کے فرائض انجام دینے کے دوران زبردست ڈکار لینے کے بجائے یہی کام کرنے کا فیصلہ کیا۔

وہ گاڑی سے اترا اور کافی کا ایک کپ لے کر جلدی جلدی حلق میں اتارنے لگا' لیکن جب وہ دوسری زمین دوز ریل میں سوار ہوا تو اسے کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ پھر پیٹ کے اس درد کے ساتھ ساتھ اعصابی اضطراب بھی حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے راستے میں تھوڑا سا وقت ضائع کر دیا تھا اور اب اس کے وہاں تاخیر سے پہنچنے کا امکان تھا۔ وہ اپنے پیٹ کے اندر اٹھنے والے عجیب درد پر قابو پانے کے لئے اپنی سیٹ پر آگے کی جانب دوہرا ہو گیا اور تب گارڈ نے اس کے سٹیشن کا نام پکارا۔ وہ اپنے بیگ کو ہاتھ میں دبوچ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس کے وزن میں غیرمعمولی اضافہ ہو گیا ہو اور اس کی چال کی چستی اور تیزی میں کمی واقع ہو گئی ہو۔

"جونہی میں گلی میں دوبارہ پہنچوں گا تو میری طبیعت سنبھل جائے گی۔" اس نے اپنے آپ کو یقین دلایا۔ یہ میٹروٹیوب تو رات بھر بند رہتی ہیں اور ان میں کوئی

روشندان بھی نہیں۔

زینے پر چڑھنا اس کے لئے دوبھر ہو گیا اور جب وہ اوپر گلی کے برابر پہنچا تو بری طرح ہانپ رہا تھا اور اس کی ٹانگوں سے جان نکل گئی تھی۔ تاخیر ہونے کے باوجود اس سے تیزی سے قدم نہیں اٹھائے جا رہے تھے۔

باہر ابھی اندھیرا تھا لیکن قصبے کے لوگ بیدار ہو چکے تھے۔ روشن بسیں گھوم رہی تھیں اور لوگ اپنے روزانہ کے دھندوں کے لئے گھروں سے باہر آ چکے تھے۔

ریلوے سٹیشن چوک کے دوسری جانب ٹھیک مخالف سمت میں تھا۔ وہ سٹیشن کے ویٹنگ روم میں پہنچا اور ایک بکنگ آفس پر جا کھڑا ہوا۔ "امسن کا ایک واپسی ٹکٹ۔"

اس نے دیکھا کہ بکنگ کلرک ریزگاری واپس دیتے وقت اسے متجسس نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔

"کیا اس نے مجھے پہچان لیا ہے؟" وہ سوچنے لگا۔ یہ احساس اسے ہمیشہ مضطرب کر دیا کرتا تھا لیکن کلرک کی نگاہوں میں شناسائی کی کوئی علامت دکھائی نہ دی۔ اس پر وہ کچھ اور متفکر ہوا۔ وہ وزن کرنے کی ایک مشین کے سامنے رکا جس پر آئینہ لگا ہوا تھا۔ اس نے آئینے میں جھانکا۔

"اوہ۔ اس کا مجھے اس انداز میں دیکھنا بلا وجہ نہیں تھا۔" اسکا چہرہ برف کی طرح سفید ہو چکا تھا جس میں نیلاہٹ بھی نمایاں تھی۔ ناممکن۔ اس کی طبیعت اس حد تک تو ناساز نہیں ہوئی۔ "یقیناً" سٹیشن کی آرک لائٹس کی وجہ سے میں ایسا نظر آ رہا ہوں۔" معدے کی اذیت لحہ بہ لحہ فزوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ یہ سب اس بڑھیا کا کیا دھرا ہے۔ وہ اسے کوسنے لگا۔ "خدا کرے اب میری حالت اس سے زیادہ نہ بگڑنے پائے۔"

اس نے سوچا ممکن ہے سٹیشن پر برومو کا ایک گلاس پینے کو مل جائے۔ کوئی بعید نہیں معدے کی اس اذیت میں کمی واقع ہو جائے۔ اس نے کلاک کی طرف دیکھا۔ نہیں دو منٹ بعد اسے دوسری گاڑی پر سوار ہونا تھا۔ وہ تو دس منٹ پہلے ہی چھوٹ چکی تھی۔

جب وہ ٹرین پر پہنچا تو سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں ایک سیٹ پر ڈھیر ہو گیا۔ خوش قسمتی سے اس کمپارٹمنٹ میں اس کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ ناسازی طبع کی حالت میں وہ لوگوں کی بھیڑ سے گھبراتا تھا۔ ٹرین حرکت کر رہی تھی اور اس کی حالت اور بھی متغیر ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا اور اسے ٹرین کی حرکت کے ساتھ ساتھ جھولنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا۔ اس کی چھڑی ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑی جسے اس نے وہیں پڑا رہنے دیا۔

اس کے ہاتھ گلے کی طرف بڑھے۔ اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور کالر کھول دیا لیکن اس سے بھی اسے کچھ سکون حاصل نہ ہوا۔ اس نے تازہ ہوا کی خاطر کھڑکی کھولنے کی کوشش کی۔ کھڑکی تو کھل گئی لیکن تازہ ہوا کی بجائے کوئلے کے ذرات اور اس کی گیس کے تھپیڑے محسوس ہوئے۔ اس کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو گئی۔ لیکن اب اس میں کھڑکی دوبارہ بند کرنے کی سکت نہیں تھی۔

یکایک اسے اپنے پیٹ کے درمیان چاقو اترتا محسوس ہوا۔ یہ اتنا تیز دھار اور اتنا غیر متوقع تھا کہ اس نے غیر ارادی طور پر اپنے بیگ کی طرف دیکھا کہ کہیں ایسا تو نہیں بیگ کھل گیا ہو اور اس کے اندر موجود بلیڈ کی تیز دھار نے اسے مجروح کر دیا ہو۔

دو ایک منٹ بعد جان کنی کی اس تکلیف کا پھر دورہ پڑا۔ اس کے بعد پھر--- اور ہر بار زیادہ شدید۔ زیادہ کاٹ دار۔ اب اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو چکی تھی۔ ٹرین دوبارہ رک کر چل چکی تھی۔ اس کی نگاہیں لحہ بھر کے لئے دھندلاتیں اور پھر صاف ہو جاتیں، لیکن درد کی لہر اب ایک تسلسل اختیار کر چکی تھی۔

"مجھے آخر دم تک اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ پہلے مجھے لازمی طور پر اپنا فرض انجام دینا ہے۔ اس کے بعد میں سو جان سے بیمار پڑ جاؤں، پرواہ نہیں۔ میں آج تک ادائیگی فرض میں ناکام نہیں ہوا۔ میرے باپ سے کبھی کوتاہی نہیں ہوئی۔ نہ ہی اس سے قبل اس کے باپ سے۔ وہ بڑی جدوجہد کے بعد اٹھا۔ لڑھکنے کے انداز میں دروازے تک پہنچا اور دھڑاک سے دروازہ کھول دیا۔

شدت درد سے اس کی کمر دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے بڑی کاوش سے جسم کو اکڑایا اور سیدھا ہو گیا۔ کھنچاؤ بہت کربناک تھا لیکن وہ اس کا مقابلہ کرتے ہوئے سیدھا کھڑا رہا۔

"کنڈیکٹر۔" اس نے گلوگرفتہ آواز میں پہیوں کے شور کے درمیان پکارا۔
"کنڈیکٹر۔ جلدی آؤ۔"

کنڈیکٹر راہداری کے اس سرے پر سے اسے اپنی سمت آتا دکھائی دیا اور اس کے بگڑے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ وہ لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ "کیا بات ہے سر؟"

"ایلسن کے اسٹیشن پر اترنا ہے۔ کیا تم اس بات کا خیال رکھو گے؟ کیا تم یقینی طور پر مجھے وہاں اتار دو گے؟ میری طبیعت کچھ ناساز ہے۔"

"بس اگلا سٹیشن ہے جناب۔ پانچ منٹ میں ہم وہاں پہنچنے والے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں سٹیشن ماسٹر سے ایمبولینس منگانے کے لئے کہہ دوں؟"

"نہیں نہیں۔ نہیں۔ کسی کو میری سدراہ نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے حاکمانہ تمکنت سے گردن تانتے ہوئے کہا۔ "میں مسٹر پیرس ہوں اور میرا کسی سے قرار ملاقات ہے جسے ہر قیمت پر نبھانا ہے۔ تم میرا بازو تھام لو اور آرام سے سٹیشن پر اتار دو اور بس۔ اس کے بعد میں خود نمٹ لوں گا۔ جیل سٹیشن کے بالکل سامنے ہے اور میرا بیگ دیکھنا کہیں میرا بیگ پیچھے نہ رہ جائے۔"

اس انکشاف پر کہ وہ "کون" ہے' کنڈیکٹر کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "لیکن جناب۔ آپ اس وقت گر پڑنے کی پوزیشن میں ہیں۔ آپ کو فوری توجہ کی ضرورت ہے۔"

"نہیں۔ بس مجھے ایلسن پر اتار دینا۔ میں پہلے ہی لیٹ ہو چکا ہوں۔ مجھے اس سے پہلی ٹرین پر سوار ہونا چاہیے تھا۔" اس نے مشکل سے سنائی دینے والی آواز میں کہا۔

ٹرین کی رفتار سست ہونے لگی۔ کنڈیکٹر نے اس کی کمر کے گرد بازو ڈالا۔ کمپارٹمنٹ کا بیرونی دروازہ کھولا اور اسے پائیدان سے اتارنے لگا۔ جلاد کا ہاتھ

جھپٹنے کے انداز میں اپنے پہلو کی طرف سرکا اور کنڈیکٹر نے اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا بیگ تھما دیا۔

"لیکن کم از کم کسی ایک آدمی کو تو موقع دیں کہ وہ آپ کو وہاں تک پہنچنے میں مدد دے۔" کنڈیکٹر نے مشورہ دیا۔

"نہیں نہیں۔ نہیں۔ روایت یہ ہے کہ مسٹر پیرس تنہا وارد ہوتا ہے۔ دروازہ صرف اور صرف اس کے لئے کھلتا ہے۔ میں ایسے وقت میں تماشا نہیں بننا چاہتا۔ اس سے میری شان پر حرف آتا ہے۔ میں فرانس کا قانون ہوں۔"

ٹرین اسے چھوڑ کر پھر حرکت میں آ چکی تھی۔ وہ ٹرین کے پاس ہی کھڑا آگے پیچھے یوں جھول رہا تھا جیسے ابھی وہ آگے گر کر ٹرین سے ٹکرا جائے گا۔ وہ جلدی سے نیچے جھک گیا۔

درد اچانک ختم ہو گیا اور اس کے جسم میں کسی نوعیت کی سنسناہٹ تک باقی نہ رہی۔ اس کے جسم پر ایک بے حسی طاری ہونا شروع ہو گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں سرد ہوتے محسوس ہونے لگے۔

"میں وہاں پہنچوں گا۔" وہ بڑبڑایا۔ "لازماً" پہنچوں گا۔ مجرم کے قتل کا یہ عارضی التوا مجھے انجام کو پہنچاتا ہے۔" اس نے ایک قدم اپنے آگے بڑھایا اور دوسرا اس کے تعاقب میں آگے رکھا۔ اس کی ٹانگیں یوں اکڑ چکی تھیں جیسے ان میں جوڑ نہ ہوں اور وہ سٹیشن کے باہر کی سمت اس انداز میں چلنے لگا جیسے کوئی مشین ہو اور کسی بھی لمحے لڑکھڑا کر دھڑام سے زمین پر گرے گی۔ صبح کے دھندلکے میں سامنے جیل کی عمارت کا مٹا مٹا سا خاکہ دکھائی دے رہا تھا۔

دفعتاً" اس کی ایک ٹانگ اس کے نیچے جھک گئی اور وہ لڑکھڑا کر ایک گھٹنے کے بل کھڑا ہو گیا۔ وہ فٹ پاتھ پر اسے محسوس کئے بغیر چل رہا تھا۔ اب اس کے پاؤں میں سنسناہٹ بالکل معدوم ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو پھر اوپر اٹھایا' لہرایا اور اپنے جسم کو زبردستی آگے بڑھانے لگا۔ اس کا ہاتھ گردن کی طرف بڑھا اور بے حسی کی حالت میں اپنا کالر درست کرنے لگا لیکن بازو کالر سے بہت اوپر چلا گیا۔ اب وہ اس کے قابو سے باہر ہو گیا تھا۔ پہلے وہ اس کے سر سے چھوٹا۔ تب وہ اسے سرکا

کر صحیح جگہ پر لایا اور اپنے کالر کے خلا کو بند کیا۔ پھر بھی وہ بٹن صحیح طرح بند کرنے میں کامیاب نہ ہوا اور بٹن دوبارہ کھل گیا۔

وہاں بے پناہ شور و غل ہو رہا تھا اور لوگ زور زور سے پکار رہے تھے۔

"نیچے لاؤ۔ نیچے لاؤ۔" اس کے سامنے جیل کے عظیم دروازے پر عجیب تجسس آمیز فضا طاری تھی۔ ایک شخص پلٹا اور اس نے جلاد کو دیکھا۔ وہ سب دو حصوں میں بٹ گئے اور جلدی سے اس کے لئے راستہ بنا دیا تاکہ وہ گزر سکے۔

☆○☆

اس نے مجھے مروا دیا۔ وہ اپنے مقصد میں ناکام رہی۔ اچانک خوف کی شدید لہر نے اسے لپیٹ میں لے لیا اور اپنی جگہ کھڑا تڑمڑ کر رہ گیا۔

جلاد اب پلیٹ فارم کے نیچے پہنچ چکا تھا لیکن کچھ نہ کچھ گڑ بڑ ضرور تھی۔ جیل کے حکام اس کی طرف دوڑ رہے تھے تاکہ اس کی مدد کر سکیں۔

وہ اس حد تک پہنچ ہی گئی تھی آخر وہ مدہوش اور غیر متوازن ہو رہا ہے۔ وہ گرتے گرتے آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ بیس سیڑھیاں کبھی طے نہیں کر سکے گا جیمز خود کو اطمینان دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک منٹ تک وہ اسے دکھائی نہیں دیا۔

پلیٹ فارم کا کنارہ بیچ میں حائل ہو گیا۔ کیا وہ گر گیا؟ کیا وہ مر گیا؟ تب ایک چرچراہٹ ابھری اور پھر سمندر کی گہرائی سے آہستہ آہستہ ابھرنے والے غوطہ خور کی مانند پلیٹ فارم کے کنارے سے جلاد کا سر نمودار ہوا۔ اسے دو گارڈ سنبھالے ہوئے تھے۔

اس نے ایک آدمی کو اپنا بیگ سپرد کرتے ہوئے کہا۔ "بلیڈ گلوٹین میں لگاؤ۔"

اب وہ پلیٹ فارم کے اوپر کھڑا تھا۔ اس نے محافظوں کو اشارہ کیا کہ وہ اپنے ہاتھ اس کے جسم سے ہٹالیں۔ اس کی نگاہیں جیمز پر گڑی ہوئی تھیں۔

"میں معذرت خواہ ہوں موسیو۔" وہ بڑبڑایا۔ "میں نے آپ کو اس طرح انتظار کے کرب میں مبتلا رکھا۔"

جیمز کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ دہشت کے عالم میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

بلیڈ گلوٹین میں نصب کر دیا گیا۔ پہیوں کو پیچھے کی جانب گھما دیا گیا اور بلیڈ

تھرمامیٹر میں پارے کی طرح ہولے ہولے اوپر اٹھتا چلا گیا۔

"محکوم الیہ کو تیار کرو۔" جلاد کے ہاتھ نے جیمز کے کندھے کو پکڑ لیا۔ اب اس میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ جیمز پر دباؤ ڈال کر اسے گھٹنوں کے بل جھکا سکے۔ یہ کام بھی اس کے لئے دوسروں نے انجام دیا۔

ایک وحشت آمیز اور شدید جذبہ امید جیمز کے دل میں ہلچل مچانے لگا۔ "وہ اپنا فرض کبھی انجام نہیں دے سکے گا۔ اب تو وہ سیدھا دیکھ تک نہیں سکتا۔ اس کی آنکھیں بے نور ہوئی جا رہی تھیں۔" جیمز کے لئے اس نے مدھم سی آواز میں کچھ کہا' لیکن وہ اب اس قابل نہیں رہا تھا کہ کچھ سمجھ سکے۔

جلاد نے زندگی کے آخری لمحات میں اس کی دلجوئی کے لئے یہ الفاظ کہے تھے۔

"حوصلہ رکھو۔ تم کچھ محسوس نہیں کرو گے۔"

باقی نیم دائرہ اب جیمز کی گردن پر آن لگا تھا اور بالٹی سرکا کر اس کے چہرے کے نیچے کر دی گئی تھی۔

"ایک منٹ اور۔" جیمز اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا۔ "ایک منٹ اور۔ ایک منٹ اور --- اور جیت میری ہو گی۔ وہ گرنے لگا ہے۔ یہ لو وہ گرا۔ وہ گرا۔ میں جیت......"

اس کی کٹی ہوئی گردن بالٹی میں اور جلاد کا بے جان جسم لکڑی کے سٹیج پر ایک ہی وقت میں گرے تھے۔ موت جیت گئی تھی۔ ان دونوں سے۔

☆☆☆

ویمپائر کی جدائی

آگ، پانی اور تیل کا ملاپ خوفناک شور برپا کر رہا تھا۔ جہاز سمندر کی تہہ کی طرف جا رہا تھا لیکن اس کے ڈھانچے سے لپکتے ہوئے شعلے آسمان کی خبر لاتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد جب جہاز کا ڈھانچا ایک کرب انگیز انداز میں غرق ہوا تو پانی کی بڑی بڑی کئی لہریں چاروں طرف پھیل گئیں۔ ایک بڑی سی لہر لائف بوٹ سے ٹکرائی۔ لائف بوٹ ڈگمگائی لیکن تھوڑی دیر بعد ہی پر سکون ہو گئی۔

وہ خطرے سے نکل چکے تھے۔ ٹونی نے اطمینان کا سانس لیا اور مستول سے ٹھوڑی ٹکا کر سمندر کے پانی کی طرف دیکھنے لگا جو اب نسبتاً" پر سکون ہو چلا تھا۔ اس کی سطح پر چھوٹی بڑی بے شمار چیزیں تیر رہی تھیں۔ ان چیزوں میں کئی سفید ٹوپیاں بھی تھیں جو تھوڑی دیر پہلے تک اس بحری جہاز کے مایہ ناز عملے کے سروں کی زینت تھیں۔ ٹوپیاں سمندر کی سطح پر تیر رہی تھیں اور ٹوپیوں والے سمندر کی تہہ میں چلے گئے تھے۔ ایک آہ بے اختیار ٹونی کے لبوں سے پھسل گئی۔

کراموئیل نے اپنی قمیض اتار کر ایک طرف ڈال دی۔ اس کی آنکھ کے نیچے ایک چھوٹا سا زخم تھا۔ وہ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے ٹونی سے مخاطب ہوا۔

"تم جہاز کے عملے میں تھے؟"

"ہاں۔"

"ملاح یا کچھ اور؟"

"ملاح۔"

"خوب۔" کراموئیل نے ایک دبی دبی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "تمہارا جسم تو اتنا توانا نظر نہیں آتا کہ ملاحی کی مشقت برداشت کر سکے۔ پر خیر۔ یہ بتاؤ کہ اس کشتی کی ناخدائی کا فرض بھی انجام دے سکو گے کہ نہیں؟"

"اس کی شاید ہی ضرورت پیش آئے۔ سمندر کا یہ حصہ جہازوں کی ایک خاصی معروف گزرگاہ ہے۔ جلد ہی کوئی نہ کوئی جہاز ہمیں بٹھا لے گا۔"

"کتنی جلد؟"

"یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ہم نے جہاز سے ایس او ایس کا پیغام بھی نشر کیا تھا کہ نہیں۔ یہ سارا سانحہ ہوا بھی تو بڑی تیزی سے ہے۔"

"ہوں۔ تو کوئی نہ کوئی جہاز ہماری مدد کو آ پہنچے گا اور اس وقت تک ہمیں بھوکوں مرنا پڑے گا؟"

ٹونی تھکے ہوئے انداز سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ "تم کلٹن میرین سنٹر کی کارکردگی کا بہت کم اندازہ لگاتے ہو میرے دوست۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے خوراک کی الماری کھول دی۔ پانی، بسکٹوں کے ڈبے، نمک لگا گوشت، ڈبوں میں بند پھلوں کے جوس، ابتدائی طبی امداد کا سامان۔ الماری میں بہت کچھ موجود تھا۔

"یہ ہمارے لئے کافی سے زیادہ ہے۔" ٹونی نے کہا اور پھر کشتی کے گرد سمندر کی لہروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "سوچتا ہوں کہ جہاز کے عملے میں سے کوئی شخص بھی زندہ بچا ہے کہ نہیں؟"

کراموئیل نے نفی میں سر ہلایا۔

"کوئی نہیں بچا۔ نہ عملے میں سے اور نہ مسافروں میں سے۔ سب جہاز کے ساتھ سمندر کی تہہ میں چلے گئے۔"

ٹونی بدستور سمندر کی لہروں کی طرف دیکھتا رہا۔ چھوٹی بڑی کئی چیزیں اب بھی سمندر کی لہروں میں ہچکولے کھا رہی تھیں۔

"خیر۔ ہمیں بھوکا نہیں رہنا پڑے گا۔" کراموئیل نے اطمینان بھرے انداز سے کہا۔ "ہاں یہ تو بتاؤ کیا اس جہاز میں تمہارا کوئی قریبی رشتے دار عزیز یا دوست بھی تھا؟"

"نہیں۔" ٹونی نے یہ کہتے ہوئے اور پھر اپنے گیلے بالوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے کراموئیل سے پوچھ لیا۔ "اور تمہارا؟"

"میرا؟ کوئی نہیں' میرے سب مر کھپ چکے ہیں۔ میں اپنے آپ کو اس بھری پری دنیا کا ایک فرد سمجھ کر مطمئن ہو لیتا ہوں۔ خوش باش اور زندہ دل لوگوں کے ساتھ کھانا پینا اور ان کی گفتگو سے محفوظ ہونا ہی میرے لئے کافی ہے۔"

لائف بوٹ میں ایک دوسرے سے قدرے فاصلے پر بیٹھے ہوئے دونوں افراد نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے ماضی سے آگاہ کیا۔ کرامویل اس کے اپنے بیان کے مطابق وہ ایک مہم جو انسان تھا۔ کوئی بستی کوئی شہر زیادہ دیر تک اسے اپنے طلسم کا اسیر نہیں رکھ سکتا تھا اور وہ ایسی جگہ شاذ ہی جاتا تھا جو اس نے پہلے دیکھ رکھی ہو۔ وہ ملایا کے ایک ریذیڈنٹ کا سیکرٹری رہ چکا تھا۔ چین میں ساگوان کا کاروبار کرتا رہا تھا۔ اس کی بنائی ہوئی چند ایک تصویروں کی نمائش پیرس کی مشہور آرٹ گیلری میں ہو چکی تھی۔ اب وہ دمشق جا رہا تھا اور اس کا مقصد ان دستاویزات کا معائنہ کرنا تھا جن میں اس کے اسلاف کا ذکر تھا۔

"میری پیدائش کے خاندانی کاغذات سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے خاندان کا آغاز کہیں اور ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے خاندانی پس منظر میں جھانکنے کے اس شغل کو تم احمقانہ تصور کرو۔ لیکن یہ میرا مشغلہ ہے جو میں کئی سالوں سے اختیار کئے ہوئے ہوں۔ میں پدرم سلطان بود کا نعرہ نہیں لگاتا' محض حقائق کی تلاش کر رہا ہوں۔"

"اس میں قباحت کی کوئی بات نہیں ہے میرے دوست۔" ٹونی نے کہا۔ "مجھے تمہارے دلچسپ اور رنگا رنگ ماضی پر رشک آتا ہے۔"

"تو کیا تمہارا ماضی بے رنگ ہے؟"

"بے رنگ تو خیر نہیں لیکن اس کے رنگ اتنے دلکش نہیں ہیں۔ میں اٹلانٹا کی نواحی بستیوں میں پیدا ہوا تھا۔ میرا بچپن خاصی مشکلات کا دور تھا۔"

"شاید تم بچپن میں بھی اتنے طاقتور نہیں تھے کہ اپنی عمر کے دوسرے لڑکوں سے نپٹ سکتے۔"

ٹونی نے اثبات میں سرہلایا۔ وہ دل میں حیران ہو رہا تھا کہ اس کے کمزور جسم اور پست قد کی طرف کرامویل نے دوسری مرتبہ اشارہ کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود

اس کے دل میں ناگواری کا احساس نہ تھا۔ ٹونی شاید کرامویل کی دلکش شخصیت سے مسحور ہو گیا تھا یا پھر اس کے خیال میں کرامویل کی اس بات میں توہین یا حقارت کا شائبہ نہیں تھا۔

"میں نے کافی کچھ پڑھا ہے۔" ٹونی نے اپنی بات جاری رکھی۔ "فلکیات سے مجھے شروع ہی سے دلچسپی تھی۔ اس دلچسپی کی بدولت ہی میں نیوی میں شامل ہوا اور اس دلچسپی کی وجہ سے نیوی سے فارغ ہونے کے بعد گلکسٹن میرین سنٹر سے وابستہ ہو گیا۔ میں اپنے گھر واپس جانے کے بجائے سمندر کے زیادہ قریب رہنا چاہتا تھا۔"

وہ کچھ دیر اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ پھر ٹونی نے کہا۔

"آؤ اب ہم کچھ کھا پی لیں اور میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنی آنکھ کے نیچے زخم کا بھی کچھ بندوبست کرنا چاہیے۔"

"کرامویل نے اپنا بھاری سر ہلا دیا۔" تم چاہو تو کھانا کھا لو' مجھے اس وقت بھوک نہیں ہے۔"

پھر اس نے اپنی زبان سے اس خون کو چاٹ لیا جو اس کی آنکھ کے نیچے زخم سے آہستہ آہستہ رس رہا تھا۔

انہوں نے لائف بوٹ کے بالائی کنارے پر نشان لگا کر دنوں کا حساب رکھنا شروع کر دیا۔ دو دن گزر چکے تھے جب ٹونی پہلی مرتبہ کرامویل کے بارے میں حیران ہوا۔

انہوں نے خوراک اور پانی کا اپنے طور پر راشننگ کا انتظام کیا تھا۔ یہ طے شدہ تھا کہ ایک شخص ایک وقت میں ایک خاص مقدار سے زیادہ خوراک اور پانی نہیں لے گا۔ یہ محض ایک احتیاطی بندوبست تھا ورنہ لائف بوٹ کی الماری میں ان دونوں کے لئے کافی سامان موجود تھا۔

مگر حیرانی کی بات یہ تھی کہ اب تک ٹونی نے کرامویل کو ایک بار بھی کھانا کھاتے نہیں دیکھا تھا اور وہ یہ سوچ کر اور زیادہ حیران ہوتا تھا کہ اس تن و توش کے آدمی کی بھوک بھی خاصی زیادہ ہو گی۔ جب ٹونی نے کرامویل سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے محض مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے دوست۔ میں اپنا کھانا رات کے وقت کھانا زیادہ پسند کرتا ہوں۔"

ٹونی نے اس کا کوئی زیادہ خیال نہ کیا۔ اس نے سوچا کہ شاید کراموئیل کا معدہ خراب ہے یا شاید وہ بھی ان بد قسمت لوگوں میں سے ایک ہے جو دوسروں کی موجودگی میں کھانا کھاتے ہوئے خوف محسوس کرتے ہیں۔ گو یہ ظاہر تھا کہ وہ ایسا خوف نہیں محسوس کر سکتا تھا کیونکہ وہ ایک اچھی خاصی جارحانہ شخصیت کا مالک تھا۔

"مجھے کیا؟" ٹونی نے اپنے آپ سے کہا۔ "چاہے وہ سر کے بل کھڑا ہو کر کھانا کھائے۔"

اگلی صبح جب ٹونی نے اپنے حصے کا کھانا لینے کے لئے الماری کھولی تو اس میں سامان کل جتنا ہی پڑا تھا۔ کوئی چیز کم نہیں ہوئی تھی۔

اس سے اگلی صبح بھی ایسا ہی ہوا۔

اب پانچ دن گزر چکے تھے۔ ٹونی کو اب ایک اور چیز بھی پریشان کرنے لگی تھی۔ وہ کھانا باقاعدگی سے اور تقریباً" پیٹ بھر کر کھا رہا تھا۔ اس کے باوجود اس پر ایک عجیب قسم کی غنودگی آمیز نقاہت طاری رہنے لگی تھی۔ اس کا حال یوں رہنے لگا تھا جیسے وہ نہ جانے کتنے دنوں کے فاقے سے ہے۔

اس نے اپنے طے شدہ حصے سے بھی زیادہ خوراک کھائی لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ کمزوری روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔

اس کے برعکس کراموئیل ہر صبح اپنی چمکتی آنکھوں اور درخشاں چہرے کے ساتھ اسے آداب کرتا۔

اب دونوں کے چہروں پر داڑھیاں نمودار ہو چکی تھیں۔ ٹونی کو تو اپنی بڑھی ہوئی داڑھی سے سخت اذیت محسوس ہوتی تھی۔ لیکن کراموئیل اپنی داڑھی کے بالوں پر بڑے مزے سے ہاتھ پھیرتا رہتا اور کبھی کبھی مونچھوں کو بھی تاؤ دینے لگتا۔

ٹونی مارے نقاہت کے کشتی میں ایک طرف لیٹا ہوا کراموئیل کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"کراموئیل۔ میرے دوست کہیں تم میری خاطر فاقے تو نہیں کر رہے؟ تم جانتے ہو اس کی قطعاً" کوئی ضرورت نہیں۔"

"نہیں میرے دوست۔ میں فاقے کاہے کے لئے کروں۔ ایسا کھانا تو مجھے آج تک میسر نہیں آیا۔"

"لیکن الماری میں جو خوراک ہے' اسے تو ہاتھ تک نہیں لگایا تم نے۔"

"اوہ۔" کراموئیل نے اپنے بھرے بھرے بازو پھیلائے۔ سورج کی روشنی اس کے جسم کے سنہری مائل بالوں سے کھیل رہی تھی۔ "یہاں کام بھی تو کوئی نہیں۔ بیکاری کی وجہ سے میرا معدہ کچھ خراب ہو گیا ہے۔"

ایک دن اور گزر گیا۔ ٹونی کی حیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر گزرتے دن' ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ خود کو زیادہ کمزور محسوس کر رہا تھا۔ کشتی میں ایک طرف لیٹے ہوئے وہ دھوپ سینک رہا تھا۔ اس کی نظر دھندلائی ہوئی سی تھی اور جسم جیسے بے حس و حرکت۔ اس نے ایک ہاتھ بڑھا کر سمندر کے پانی میں ڈالا لیکن جب اس کی انگلیاں ایک مچھلی کے جسم سے ٹکرائیں تو اس نے فوراً" اپنا ہاتھ باہر کھینچ لیا۔

کراموئیل برابر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"یہ شارک مچھلیاں بھی بالکل قدرت کی اور چیزوں کی طرح ہیں۔ یہ دوسروں کو مار کر خوراک حاصل کرتی ہیں مگر اس کے بدلے کچھ نہیں دیتیں اور پھر ان سے بڑی مچھلیوں کی خوراک بن جاتی ہیں۔ یہی سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ یہی دنیا ہے۔"

"انسانوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"وہ تو ان سب سے بدتر ہیں۔"

ٹونی' کراموئیل کے اس جواب پر محض غور کرتا رہ گیا۔

اب سات دن گزر چکے تھے۔ ٹونی اور کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ اسے کامل یقین تھا کہ کراموئیل نے خوراک کی الماری کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

نو دن گزر چکے تھے جب ٹونی کو یہ معلوم ہوا کہ کراموئیل فی الواقع اپنے آپ کو بھوکوں نہیں مار رہا تھا۔ اسے اپنی خوراک برابر مل رہی تھی اور ٹونی پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ وہ خوراک کیا ہے؟ یہ انکشاف خاصہ ہولناک تھا۔

☆○☆

رات کا وقت تھا اور سمندر کسی قدر ہیجانی حالت میں تھا۔ سمندر کی لہریں رہ رہ کر لائف بوٹ سے ٹکرا رہی تھیں۔ ان لہروں کی دھپ دھپ کی آواز نے ٹونی کو گہری نیند سے بیدار کر ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی اسے اپنے قریب کسی وجود کا تکلیف دہ احساس بھی ہو رہا تھا۔

ٹونی نے بے چینی سے کروٹ لی اور وہ وجود ذرا پرے ہٹ گیا۔ ٹونی نے اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ کرامویل اس کے قریب کھڑا تھا اور اس پر جھکا ہوا تھا۔

"تم نیند میں چیخیں مار رہے تھے میرے دوست۔ کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہے تھے؟"

کرامویل کی آواز انتہائی شیریں اور تسکین بخش لہجہ لئے ہوئے تھی۔

"میرا گلا۔ اس میں سخت چبھن اور جلن ہو رہی ہے۔ میں....."

"یہ سمندر کی نمکین ہوا کا اثر ہے میرے دوست۔ صبح تک تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

ٹونی کو اپنا چہرہ مٹی کی طرح بے جان محسوس ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے ہونٹ کھولے۔

"میں۔ میرا خیال ہے۔ میرا خیال ہے۔ میں مر رہا ہوں۔"

"نہیں تم مر نہیں رہے ہو۔ تم نہیں مرو گے۔ تمہیں مرنا نہیں چاہیے۔ تم مر گئے تو میں بھی مر جاؤں گا۔"

ٹونی، کرامویل کے ان الفاظ پر غور کرنے لگا۔ بادی النظر میں یہ الفاظ ایک دوست کی دوسرے دوست سے دلی وابستگی کا مظہر تھے۔ لیکن ٹونی محسوس کر رہا تھا کہ ان الفاظ کے پیچھے کوئی اور حقیقت بھی چھپی ہوئی ہے اور عین ممکن ہے وہ کوئی خوفناک حقیقت ہو۔

اس کا گلا بری طرح جل رہا تھا۔ جلن اور چبھن سے بے تاب ہو کر اس کا ایک ہاتھ گلے تک پہنچا تو اسے کسی گاڑھی گاڑھی سیال شے کا لمس محسوس ہوا۔ ایک عجیب سے جذبہ تجسس کے تحت اس کا ہاتھ گلے سے ہو کر زبان تک آ گیا لیکن

جب ٹونی نے اپنے ہاتھ پر زبان پھیری تو اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

یہ خون تھا۔۔۔ اس کا اپنا خون۔

اور یہ خون کرامویل پی رہا تھا۔

بجلی کے کوندے کی طرح اس پر ایک ہولناک حقیقت کا انکشاف ہوا جو کتنے ہی دنوں سے اسے پریشان کئے ہوئے تھی۔ کرامویل پچھلے نو دن سے اس کا خون پی رہا تھا۔ اس کی کمزوری کا باعث یہی چیز تھی۔

وہ کوشش کر کے اٹھا اور کہنیوں کے بل ہو بیٹھا اور پھر کرامویل سے مخاطب ہوا۔

"کرامویل۔ تم ڈریکولا ہو۔ وہ عفریت جو رات کے اندھیرے میں انسانوں کا خون پیتا ہے۔ بتاؤ۔ کیا نہیں ہو؟"

اس کے جواب میں اندھیرے میں کرامویل کی ایک طویل اور غمگین ہنسی سنائی دی۔

"میری بات کا جواب دو کرامویل۔" ٹونی نے قدرے برہمی سے کہا۔ "تم ڈریکولا ہو نا؟"

"ہاں۔"

اور ٹونی یہ سنتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو سورج کی کرنیں اس کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر رہی تھیں۔ اس نے اپنا سر دوسری طرف پھیرتے ہوئے ایک لمبا سانس لیا۔

اس کے ساتھ ہی اس کے کان میں سیٹی کی آواز آئی۔ کرامویل سیٹی پر کسی جرمن لوک گیت کی دھن بجا رہا تھا۔ ٹونی کو ہوش میں آتے دیکھ کر کرامویل نے سیٹی بجانی بند کر دی۔

"آداب عرض ہے میرے دوست۔ امید ہے رات تم نے خوب آرام سے بسر کی ہو گی۔"

ٹونی آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے پھڑپھڑا رہے تھے۔

کراموئیل مسکرا دیا۔

"تمہیں میری طرف ایسی نظروں سے نہیں دیکھنا چاہیے میرے دوست۔ یقین رکھو کہ میں بالکل بے ضرر ہوں۔" پھر وہ ایک ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہنے لگا۔

"تم جانو۔ صورت حال اس سے بدتر بھی ہو سکتی تھی۔ مثلاً" میں ڈریکولا کی بجائے ویمپائر یا بھیڑیا ہوتا تو؟"

اس نے دو ایک لمحے انتظار کیا۔ پھر ٹونی کو خاموش پا کر کہنے لگا۔

"تم شاید انسان کے بھیڑیا بن جانے کو محض افسانہ طرازی سمجھتے ہو گے لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ بالکل اس طرح جیسے یہ سمندر، یہ کشتی اور ہم تم ایک حقیقت ہیں۔ ایک بار میں پیرس میں ایک ایسی عورت کے ساتھ تین مہینے رہ چکا ہوں جو دن کے وقت پبلک میں خدمتگار اور رات کے وقت بھیڑیا ہوتی تھی۔ وہ اپنے شکار کا انتخاب اس کی جلد دیکھ کر کرتی تھی۔"

ٹونی خاموشی سے کراموئیل کی باتیں سنتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ کراموئیل محض صورت حال کی سنگینی کو گوارا بنانے کی خاطر ادھر ادھر کی ہانک رہا ہے۔

"اور جب پولیس افسر نے دیکھا کہ وہ عورت جس گولی سے ہلاک کی گئی ہے' وہ محض عام سیسے کی ہے تو وہ کہنے لگا۔ صاحبان۔ آپ نے اس حسینہ سے بڑی زیادتی کی ہے۔ ہا ہا۔ واقعی یہ بری زیادتی تھی کہ اسے چاندی کی گولی کی بجائے سیسے کی گولی سے ہلاک کر ڈالا گیا۔ وہ لمحہ میرے لئے بڑا یاس انگیز لمحہ تھا....."

"بند کرو یہ بکواس!" ٹونی بے چین ہو کر چیخ اٹھا۔ "جاؤ چمگادڑ یا کچھ اور بن کر اڑ جاؤ اور میری نظروں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ۔ میرا خون اور تمہارے معدے میں....."

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن نقاہت نے اس پر غلبہ پا لیا اور وہ بے دم سا ہو کر کشتی کے فرش پر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور گلا یوں بھاری محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بیک وقت قہقہہ لگانا اور قے کر دینا چاہتا ہو۔

"میں اپنے آپ کو چمگادڑ کی صورت میں تبدیل نہیں کر سکتا میرے دوست۔" کراموئیل کہہ رہا تھا "اور نہ میں دن کے وقت کسی تابوت میں ہوتا ہوں

اور نہ دن کی روشنی میرے لئے موجب ہلاکت ہے۔ یہ سب توہمات ہیں اور ہم عام انسانوں کے لئے اتنے خطرے کا باعث نہیں جتنا عام انسانوں کے یہ جہالت پر مبنی توہمات ہمارے لئے باعث خطر ثابت ہوئے ہیں۔ ہمیں جاہل انسانوں سے خوف آتا ہے' کیونکہ ان کی تعداد بے حد زیادہ ہے اور ہماری تعداد بے حد کم۔"

ٹونی نے آنکھیں کھول دیں اور کوشش کر کے کہا۔

"تم دوبارہ میرے جسم کو ہاتھ تک نہیں لگاؤ گے۔ سنا کراموئیل۔"

"سن لیا میرے دوست۔ لیکن میں مجبور ہوں۔"

"لیکن میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ مجھ میں ابھی اتنی طاقت ہے کہ تمہیں اپنے جسم سے دور رکھ سکوں۔"

لیکن اتنی طاقت تو یقیناً" نہیں کہ اگر میں تمہارا کھانا پانی بند کر دوں تو اسے حاصل کر سکو۔"

ٹونی نے بے بسی سے سر ہلایا۔ کراموئیل ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔

"میں سمندر میں چھلانگ لگا دوں گا۔"

ایسا تو میں قطعاً" نہیں ہونے دوں گا۔ آخر تم اس ناگزیر صورتحال سے سمجھوتہ کیوں نہیں کر لیتے میرے دوست ہر روز میں تمہیں تمہارے حصے کا راشن دوں گا اور رات تم مجھے میرا راشن دو گے۔ تم میرے سہارے زندہ رہو اور میں تمہارے سہارے۔ اس سے زیادہ انصاف کی بات کیا ہو سکتی ہے؟"

"تم وحشی ہو۔ خونخوار اور درندے ہو۔ میں ہرگز....."

کراموئیل نے ایک آہ بھری اور منہ پھیر کر سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"وحشی۔ خونخوار۔ درندہ --- عام انسان ہمیں ایسے ہی خطاب دیتے رہتے ہیں۔ وہ انسان جو زندہ جانداروں کا گوشت بھون کر کھا جاتے ہیں۔"

ٹونی کے لئے برضا و رغبت اس ناگزیر صورتحال سے سمجھوتا کرنا سراسر ناممکن تھا۔ کراموئیل پورے نو دن تک اس کی لاعلمی میں اس کا خون پیتا رہا تھا لیکن اب کراموئیل کا پیٹ بھرنے کے لئے خود شہ رگ پیش کرنے کا تصور اس کے لئے بڑا ہی

اذیتناک تھا۔ اس نے انکار کر دیا۔

اور جواب میں کرامویل نے اس پر خوراک کا دروازہ بند کر دیا۔ کرامویل کھانے اور پانی کی الماری پر پہریدار بن کر کھڑا ہو گیا۔

"بھرے گا تو ہم دونوں کا پیٹ بھرے گا۔ بھوکوں مریں گے تو ہم دونوں بھوکوں مریں گے۔"

کرامویل باآسانی دو چار روز کا فاقہ برداشت کر سکتا تھا لیکن ٹونی کی حالت اس قابل نہ تھی کہ وہ ایک دن کا فاقہ بھی برداشت کر سکے۔ ایک وقت کا کھانا نہ ملنے پر ہی جب اس کی حالت غیر ہونے لگی تو اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔

اب ٹونی دن کے اجالے میں اپنا پیٹ بھرتا تھا اور کرامویل رات کی تاریکی میں --- اور ٹونی کی توقع کے بالکل برعکس یہ صورت اتنی تکلیف دہ ثابت نہیں ہوئی جتنی کہ اسے توقع تھی۔ کرامویل جب اس کا خون پینے کے لئے اس کی شہ رگ میں دانت گاڑتا تو ایک شدید چبھن سی ضرور محسوس ہوتی لیکن اس کے بعد اس پر ایک مدہوشی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی جیسے اسے مارفیا کا انجکشن لگا دیا گیا ہو۔

اور ہر بار اسے پہلے سے کم چبھن محسوس ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ یہ ایک ایسا معمول بن گیا جس کی شاید کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ اب دن میں اس کا ضمیر اسے ملامت نہیں کرتا تھا اور رات اس کے لئے ایک مدہوشی کا پیغام بن کر آتی تھی۔

کرامویل ڈریکولا یا ویمپائر تھا یا نہیں؟ اس کی باتیں ٹونی کے لئے یقیناً" بڑی دلچسپ تھیں۔ وہ واضح طور پر ایک کامیاب مجلسی شخصیت کا مالک تھا۔

"تم بہت زرد ہو گئے ہو میرے دوست۔" ایک روز کرامویل نے ٹونی سے کہا۔ "شاید میں بہت حریص ثابت ہو رہا ہوں۔ تمہارے اس زرد زرد چہرے اور بڑھی ہوئی داڑھی کو دیکھ کر مجھے آسٹریا کا ایک شاعر یاد آتا ہے۔ ایک طویل عرصے تک وہ میرا دل پسند ساتھی رہا۔ تم شاید یہ نہیں جانتے کہ ہم ہر ایرے غیرے کا خون پینے کے عادی نہیں ہیں جیسا کہ تمہاری کہانیوں میں لکھا جاتا ہے۔ ہم اپنی خوراک کے معاملے میں انسانوں سے کہیں زیادہ نفاست پسند واقع ہوئے ہیں۔"

"تم --- تم ڈریکولا کیسے بن گئے؟" ٹونی نے پوچھا۔

"میں --- ایرک کرامویل ڈریکولا کیسے بن گیا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس میں بڑے پیچ ہیں۔ ایسے پیچ جنہیں کھولنا آسان نہیں۔ بہرحال میں تمہیں اتنا بتا سکتا ہوں کہ میرے آباؤاجداد بھی ڈریکولا ہی تھے۔ ڈریکولا اور ویمپائر بھی۔ رہا یہ مسئلہ کہ ہم کیسے وجود میں آئے تو اس کا حتمی جواب دینا بڑا مشکل ہے۔"

کرامویل کچھ دیر تک اپنی داڑھی کو سہلاتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"بعض لوگ کہتے ہیں کہ انسان اور بندر جب اپنے مورث اعلیٰ سے پیدا ہوئے تو ان کے ساتھ ایک تیسری نسل بھی تھی جسے ان دونوں کی نفرت نے قعر گمنامی میں دھکیل دیا۔ دوسروں کا کہنا ہے کہ ہم کسی دوسرے سیارے سے کرہ ارض پر آئے ہیں۔ بعض کتابوں میں تو اسطرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ روئے زمین پر ایک نسل انسانوں سے بالکل مختلف بھی تھی۔ لیکن انسانی غلبے کے زیراثر اس نے انسانوں جیسے اطوار اختیار کر لئے اور پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہم شیطان کے چیلے اور شیطانی فوج کا ایک دستہ ہیں اور شیطان نے ہمیں دنیا میں رنج و غم پیدا کرنے کے لئے چھوڑ رکھا ہے۔"

ایک طویل سانس لینے کے بعد کرامویل نے پھر کہنا شروع کیا۔

"روایات۔ من گھڑت روایات۔ انہی من گھڑت اور جاہلانہ روایات کی وجہ سے ہم پر بے انتہا ظلم توڑے گئے ہیں۔ ہمیں قید میں ڈالا گیا ہے۔ زندہ جلایا گیا ہے۔ محض اس بنا پر کہ ہمارے جسم کا کیمیائی نظام انسانی جسم کے کیمیائی نظام سے مختلف ہے۔ ہم اپنی غذا براہ راست سرچشمہ زندگی سے حاصل کرتے ہیں جبکہ انسان مردہ جانوروں کا گوشت بھون کر کھاتا ہے اور اس کے باوجود ہمیں وحشی اور درندہ کہا جاتا ہے۔ تم خود انصاف کرو۔ وحشی اور درندہ کون ہے۔ ہم یا تم؟

پھر ٹونی کو خاموش پاکر وہ خود ہی بولا۔

"انسان --- انسان ہی درندہ ہے۔ انسان ہی وحشی ہے۔"

زندگی اسی طور رینگتی رہی۔ دن کو ٹونی کو کھانا ملتا رہا اور رات کو کرامویل کو اپنی غذا دستیاب ہوتی رہی۔ اب ٹونی کے دل میں کرامویل کے متعلق خوف یا نفرت

کا کوئی جذبہ نہیں رہا تھا۔ اس کی جگہ ایک عجیب انس اور اپنائیت کے جذبے نے لے لی تھی۔

ٹونی کا دل ایک عجیب طرح کے سکون سے سرشار رہنے لگا تھا۔ اب اس کے دل کے کسی گوشے میں بھی مزاحمت کا خیال نہیں رہا تھا۔ کراموبل کی زندگی اس کی اپنی زندگی کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ اندھیرے کی یہ صحبت اس کے لئے سراپا تسکین ثابت ہو رہی تھی۔

اب ٹونی رات کے وقت کراموبل کی آمد کا یوں منتظر رہنے لگا تھا جیسے وہ کسی دوست کی آمد کا منتظر ہو۔ ہر دن اور ہر رات وہ آپس میں اپنی زندگیوں کا تبادلہ کرتے تھے۔ ہر روز کراموبل اس کے وجود کو زندگی سے بھرتا تھا اور پھر ہر شب اس سے اپنی قوت حیات حاصل کرتا تھا۔ ان دونوں کی زندگی ایک ہو چکی تھی۔

اب انہوں نے کشتی پر نشان لگانے چھوڑ دیئے تھے۔ دونوں میں سے کسی کو بھی ٹھیک سے یاد نہ رہا تھا کہ انہیں سمندر کی وسیع پہنائیوں میں بھٹکتے ہوئے کتنے دن ہو چکے ہیں۔

پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ کراموبل' ٹونی کے راشن میں کمی کرنے پر مجبور ہو گیا۔

"تم دیکھ ہی رہے ہو میرے دوست۔ اس کے بغیر اور کوئی چارہ نہیں۔"

"تو کیا ہمارے پاس کھانے پینے کا سامان بالکل ختم ہونے والا ہے؟"

"ہاں میرے دوست۔" اس نے افسوس بھرے انداز سے کہا۔ "تقریباً" ختم ہونے والا ہے اور اگر تمہارا راشن ختم ہو گیا تو ظاہر ہے کہ میرا راشن بھی ختم ہو جائے گا۔"

"مجھے اس کی کوئی خاص فکر نہیں ہے دوست۔" ٹونی نے آہستہ سے جواب دیا۔ "میں تو اب بھوک بھی بہت کم محسوس کرتا ہوں۔ پہلے تو خوب پیٹ بھر کر کھانے کے بعد بھی میری تسلی نہیں ہوتی تھی لیکن اب تو کھانے کو ہاتھ لگانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ شاید یہ اتنے دنوں کی ست ست اور بیکار زندگی کا اثر ہے۔"

کراموبل مسکرا دیا۔

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو اور شاید نہیں۔ بہرحال اب ہمیں کسی آتے جاتے جہاز پر نظر رکھنی چاہیے۔ تم تو کہتے ہو کہ یہ جہازوں کی ایک معروف گزرگاہ ہے لیکن اب تک کوئی جہاز ادھر سے گزرتا دکھائی نہیں دیا۔ بہرحال اگر کوئی جہاز ہماری مدد کو جلد نہ آیا تو ہمیں بھوکوں مرنا پڑے گا۔ فی الحال تو میں نے تمہارا راشن کم کیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ مجھے اپنے راشن میں بھی کمی کرنی ہو گی۔"

"مجھے اس کی پرواہ نہیں۔"

"تمہاری حالت بے حد قابل رحم ہے میرے دوست۔" کراموبل نے کہا۔ "جب تمہاری طاقت بحال ہو جائے گی تو پھر تمہیں اس کی بہت پرواہ ہو گی۔ پھر تم بھی میری طرح زندہ رہنے کی خواہش کرو گے۔"

"ہو سکتا ہے لیکن اس وقت تو میں محسوس کرتا ہوں کہ موت بہت آسان اور خوشگوار ہو گی اور شاید موت کو گلے لگا لینا دنیا میں واپس جانے سے کہیں زیادہ بہتر ہو گا۔"

"دنیا دکھوں اور برائی سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں میرے دوست۔ لیکن زندہ رہنے کی لگن ہم سب کو اس دنیا میں زندہ رہنے پر مجبور کئے رکھتی ہے۔"

ٹونی نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ بے حس و حرکت لیٹا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔ جب سے جہاز غرق ہوا تھا --- تب سے پہلی بار وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اسے دنیا میں واپس جانے سے خوف محسوس ہو رہا ہے۔ اور پھر کراموبل کا مسئلہ بھی تو ہے۔ کیا اس کے متعلق حکام کو اطلاع دینی چاہیے؟

"نہیں۔" اس کے ذہن نے فیصلہ دیا اور دل نے تائید کر دی۔ "اس طرح تو دنیا والوں کو میرے متعلق پتہ چل جائے گا کہ میں جانتے بوجھتے ایک ویمپائر کو اپنا خون پلاتا رہا ہوں۔ ایک دو روز نہیں' نہ جانے کتنے روز۔"

جو کچھ ہوا تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا۔ وہ انتہائی شرمناک اور قابل نفرین تھا لیکن وہ جو کچھ کر رہا تھا اس کے سوا اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔

پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ دنیا میں واپس پہنچنے کے بعد بھی کراموبل اس کے

ساتھ تعلق برقرار رکھنے پر اصرار کرے۔ پھر کیا ہوگا؟

یہ خیالات ٹونی کو بری طرح پریشان کرنے لگے۔ ٹونی نے اس طرح پہلے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ لیکن جلد ہی اس کے صاف ذہن پر دھند سی چھا گئی اور ٹونی اور کرامویل کی زندگی پھر اسی معمول پر استوار ہو گئی۔

اس روز جب کرامویل نے افق پر دھواں دیکھا تو ٹونی مشکل ہی سے ہوش میں تھا۔ کرامویل نے اسے اپنے بازوؤں کا سہارا دے کر کھڑا کیا تاکہ وہ بھی دیکھ سکے۔ یہ ایک جہاز تھا اور کشتی کی طرف ہی آ رہا تھا۔

"تو گویا اب ہمارا سفر ختم ہونے والا ہے۔" کرامویل نے اپنے ہاتھ نرمی سے ٹونی کے شانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اور اس کے ساتھ ہی ہماری زندگی کا یہ رنگینی سے لبریز منظر بھی نظروں سے اوجھل ہو جانے والا ہے۔" پھر کرامویل کے ہاتھوں کی گرفت سخت ہو گئی۔

"میرے دوست۔ اس سے پہلے کہ جہاز یہاں پہنچے' اور جہاز کے لوگ اپنے روایتی شوروغل کے ساتھ ہماری امداد کو آئیں اور ہماری پریشانیاں ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائیں' آؤ ذرا آخری بار۔" اس کے ساتھ ہی کرامویل کا سر جھکا اور اس کے ہونٹ ٹونی کے حلق پر آ گئے۔

ٹونی سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ کرامویل کے کندھوں پر سے اس نے قریب آتے ہوئے جہاز کی طرف دیکھا۔ یہ جہاز افق پر ایک دھبا معلوم ہو رہا تھا اور یہ دھبا آہستہ آہستہ بڑا ہوتا جا رہا تھا۔

اس نے سوچا۔ "اس جہاز پر آدمی ہوں گے۔ نہ جانے کتنے۔ اگر انہوں نے کرامویل کو میرا خون پیتے دیکھ لیا تو نہ جانے کیا سمجھیں۔ کیا کریں؟"

اور وہ جو اب تک برضا و رغبت کرامویل کو اپنا خون پلاتا آیا تھا۔ دوسرے انسانوں کے امکانی ردعمل کا تصور کر کے پریشان ہو گیا۔ اس پر ایک سراسیمگی کی کیفیت طاری ہو گئی اور اس سراسیمگی میں اس نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔

کشتی یکایک ڈگمگا گئی۔ کرامویل ٹونی کے اس ردعمل کے لئے قطعاً تیار نہ تھا۔

ٹونی نے جو ہاتھ پیر مارنے شروع کئے تو اس کا ایک پیر کرامویل کے پیٹ سے ٹکرایا اور کرامویل دھڑام سے کشتی کے کنارے سے الٹ کر پشت کے بل سمندر میں جا گرا۔

شارک مچھلیاں تیزی سے اس کی طرف لپکیں لیکن پھر انہوں نے کرامویل کو اپنی خوراک کے لئے ناموزوں قرار دے دیا۔ مگر یہ فیصلہ انہوں نے کرامویل کی زندگی کا خاتمہ کرنے کے بعد کیا تھا اس سے پہلے نہیں۔

سطح سمندر پر کرامویل کی لاش دیکھ کر ٹونی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بار بار کہے جا رہا تھا۔ "کرامویل۔ میرے دوست۔ مجھے افسوس ہے۔"

جب تک کرامویل کشتی میں اس کے ساتھ تھا' ٹونی کو جہاز کا امید بھرا انتظار تھا لیکن اب کرامویل کی لاش کو دیکھنے کے بعد امید کی جگہ ایک پراسرار خوف نے لے لی تھی۔ جیسے جیسے جہاز کشتی کی طرف آتا جا رہا تھا' ٹونی کا یہ پراسرار خوف بڑھتا جا رہا تھا اور اپنی اس کیفیت پر اسے خود بھی حیرانی تھی۔

جہاز کشتی کے قریب آیا۔ جہاز کے عملے کے چند آدمی جب اس کی طرف آئے تو ٹونی کا خوف اس کے لئے ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔ وہ لوگ اسے مصیبت سے نجات دلانے آئے تھے لیکن ٹونی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس کا خون کرنے بلکہ اس کا خون پینے کے لئے آ رہے ہیں۔ اس نے ایک زوردار چیخ ماری اور سمندر میں چھلانگ لگا دی۔

اس سے پہلے کہ جہاز کے عملے کے افراد اس کی مدد کو پہنچتے' شارک مچھلیاں اس کی زندگی کا خاتمہ کر چکی تھیں اور کرامویل کے برعکس انہوں نے ٹونی کو اپنی خوراک کے لئے ناموزوں قرار نہیں دیا تھا۔

☆☆☆

دیوتا کا تحفہ

ڈاکٹر لاشاری کی سوغاتوں میں سب سے زیادہ قیمتی اور اہم چیز ایک بہت بڑا عمدہ لعل تھا جو انہیں افریقہ کے ایک حبشی قبیلہ کے سردار کی لڑکی کا علاج کرنے کے معاوضے میں حاصل ہوا تھا۔ ڈاکٹر لاشاری نے اس قیمتی لعل کے متعلق بہت سی عجیب عجیب روایتیں سنائیں۔ منجملہ اس کے یہ بھی تھی کہ یہ لعل اس قبیلہ میں سینکڑوں برس سے چلا آتا تھا اور ہر سردار اس کی جان و دل سے حفاظت کرتا تھا۔ یہ لعل ایک مرمریں مرتبان میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس مرتبان کو بھی دیکھا۔ عجیب بے ڈھنگا کالے پتھر کا مرتبان تھا جس پر عجیب و غریب تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

روایت مشہور تھی کہ لعل کسی دیوتا کا تھا۔ اس میں یہ تاثیر تھی کہ چوری نہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ اسے چرانے کی متعدد بار کوشش کی گئی مگر یہ پھر اس مرتبان میں واپس آ گیا۔ یہ بات مجھے کسی قدر انوکھی معلوم ہوئی اور ڈاکٹر صاحب سے اس کی مزید توضیح چاہی۔ انہوں نے اپنے چشم دید واقعات سنا کر مجھے اور بھی حیران کر دیا کہ یہ کئی بار چوری کیا گیا مگر کسی نہ کسی طرح چور کا پتہ لگ گیا اور پھر اس مرتبان میں واپس آ گیا۔

ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ انہیں قبیلہ کا محسن سمجھ کر وہ منتر بھی بتا دیا گیا تھا جس کے ذریعے اس لعل کے چرانے والے کا پتہ چل جاتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب قیام افریقہ میں تھوڑا بہت جادو بھی سیکھ گئے تھے اور وہاں رہنے سہنے کی وجہ سے تھوڑا بہت دماغ میں وہم بھی پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ لعل کی گمشدگی کے بعد دوبارہ واپس آ جانے کی روایت پر پورا یقین رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ بتایا ہوا منتر حرف بحرف صحیح ہے کبھی خطا نہیں کرتا۔

میں نے اس لعل کو دیکھا۔ کافی بڑا تھا۔ ایک اخروٹ کی طرح اور کافی چمکدار۔ مقامی حبشی اسے اپنی زبان میں "شوگوگمائی" کہتے تھے۔ جس کا ڈاکٹر صاحب

نے اردو میں ترجمہ "خونی آنکھ" کیا تھا۔ واقعی اس کی شکل آنکھ سے مشابہ تھی اور اس قدر سرخ تھا جیسے خون کبوتر یا انار کا دانہ۔

میں اس کی روائتیں سن کر اپنے گھر واپس آیا اور پھر دوستوں میں اس کا تذکرہ کیا۔

☆○☆

تھوڑے ہی عرصہ میں اس عجیب و غریب اور ساتھ ہی ساتھ قیمتی لعل کی افواہیں شہر بھر میں مشہور ہو گئیں۔ ڈاکٹر لاشاری کے دو دوست تھے۔ اختر اور غوث بخش۔ انہوں نے بھی لعل دیکھا اور اس کے متعلق روایتوں کو سنا۔ ایک دن دل میں بدی آ گئی اور اس لعل کو اڑانے کے لئے سازش کرنے لگے۔ وہ کہتے تھے کہ لعل کے واپس آنے کے متعلق جتنی روایتیں مشہور تھیں وہ محض چوروں کو ڈرانے اور دھوکہ دینے کا ایک طریقہ تھا۔ ایک دن اختر نے غوث بخش سے کہا۔ "لاشاری کا لعل اڑاؤ۔"

"مگر اس کے متعلق تو سنا ہے کہ وہ دوبارہ مرتبان میں ---"

"تم بھی بڑے توہم پرست ہو۔ عقلمند --- بھلا ایسا ممکن ہو سکتا ہے؟"

"تو کیا سکیم سوچی ہے؟"

"پرسوں ان کے گھر دعوت ہے۔ ہم دونوں کو بھی بلایا ہے۔ دونوں رات کو چلیں اور دعوت کے دوران لعل اڑا لیں گے۔"

"کیسے؟"

"سنو۔ انہیں آج کل لعل اور افریقی عجائبات کے حالات سنانے کا شوق چرا رہا ہے۔ پس اغلب ہے کہ پرسوں بھی دعوت میں اس کا ضمناً ذکر آ جائے گا۔ تم تجویز کر دینا کہ اسے سب حاضرین محفل کے سامنے دکھایا جائے۔ وہ یقیناً مہمانوں کی خاطر مرتبان لے آئیں گے اور لعل نکال کر دکھانا شروع کریں گے۔ جب لعل سب مہمانوں میں یکے بعد دیگرے گردش کر رہا ہو' تم چپکے سے میز پر سے اٹھ کر کمرے کے اس حصے میں پہنچ جانا جہاں بجلی کا سوئچ لگا ہوا ہے۔ جب میں اشارہ کروں تم فوراً روشنی گل کر دینا۔ میں اس عرصہ میں لعل اڑا لوں گا۔ پھر دیکھیں گے

افریقہ کا جادو اسے کیونکر مرتبان میں واپس لا سکتا ہے۔ اگر ایک دفعہ لعل میرے ہاتھ آگیا تو پھر اس کا ملنا محال ہے۔ اگر پھر بھی مرتبان میں واپس چلا گیا تو پھر ہم یقین کر لیں گے کہ ڈاکٹر کی توہم پرستی درست ہے اور واقعی یہ لعل آسیب زدہ ہے اور اس میں کچھ "اسرار" ہے اور اس کے متعلق جتنی افواہیں مشہور ہیں وہ سب سچ ہیں۔"

"تم کیا اشارہ کرو گے؟"

"دیکھو۔ اچھی طرح سمجھ لو۔ اس میں مطلق دیر نہ ہو۔ جب لعل دورہ کرتا ہوا میرے پاس بیٹھنے والے مہمان کے قریب پہنچ جائے گا تو میں میوہ کی تھالی میں سے ایک اخروٹ اٹھا کر اپنے لبوں سے لگاؤں گا۔ اس وقت تم روشنی گل کر دینا۔ میں اندھیرے میں چپکے سے لعل اڑا دوں گا۔ تم بھی اپنی جگہ آ بیٹھنا۔ سمجھ گئے۔ کتنا عمدہ پلاٹ ہے کوئی وجہ نہیں کہ خطا کر جائے۔ اگر لعل ہاتھ آگیا تو پانچ ساڑھے پانچ لاکھ سے کم نہ ہو گا۔"

دونوں نے خوب اچھی طرح انتظامات کر لئے بلکہ ایک دفعہ لعل چرانے کی مشق بھی کر لی اور دعوت کا انتظار کرنے لگے۔

دعوت کی شام آگئی۔ میں بھی مدعو تھا۔ وقت مقررہ پر ڈاکٹر لاشاری کی مشہور کوٹھی پر پہنچ گیا۔

دعوت کا کمرہ خوب سجا ہوا تھا۔ بیچ میں قرینہ سے لمبی لمبی میزیں بچھی ہوئی تھیں جن کے گرد مہمان آ آ کر بیٹھتے جاتے تھے۔ چہار طرف بجلی کے قمقمے روشن اور تمام کمرہ بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ میں بھی ایک کونے میں جا بیٹھا۔

اختر اور غوث بخش صاحبان ممتاز مہمانوں میں سے تھے لیکن تعجب تھا کہ دونوں دوست آج چپ چپ بیٹھے تھے۔

ڈاکٹر لاشاری آئے۔ بہت خوش خلق اور ہنس مکھ میزبان تھے۔ آٹھ بجے نوکروں نے کھانا چننا شروع کیا۔ میزبان سمیت دعوت میں کل تیرہ آدمی تھے۔ کھانا شروع ہوا اور پیانو کی دلنواز صدا کمرے میں گونجنے لگی۔

دوران طعام میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ ابھی مہمان آئس کریم

ختم کر کے مٹھائی کھا رہے تھے کہ کسی مہمان نے افریقہ کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے موقعہ غنیمت سمجھ کر لکچر دینا شروع کر دیا۔

جب تمام پرلطف واقعات یکے بعد دیگرے سنائے جا چکے تو مشہور لعل "خونی آنکھ" کی باری آئی۔ دو ایک لوگوں نے جنہوں نے اس روایتی لعل کے متعلق بہت کچھ سنا تھا' مگر کبھی آنکھ سے نہ دیکھا تھا' اسے دیکھنے کے لئے بہت اصرار کیا۔ میں نے بھی تجویز دی کہ میزبان صاحب اس لعل کو سب حاضرین محفل کو دکھائیں۔

ڈاکٹر لاشاری نے سب حاضرین کی طرف دیکھا اور اپنے کمرے میں سے ایک سیاہ مرتبان اٹھا لائے۔ اسے میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

☆○☆

مرتبان میز پر رکھا گیا۔ سب لوگوں کی پرشوق نظریں اس عجیب الہیئت افریقی نادر لعل کی زیارت کرنے کے لئے بے تاب نظر آتی تھیں۔ غوث بخش کو شاید سخت گرمی لگ رہی تھی کہ کمرے میں ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔

ڈاکٹر لاشاری نے مرتبان میں سے ایک چرمی بٹوہ نکالا اور اسے کھولا۔ اندر سے ایک جگمگاتا ہوا اخروٹ کے برابر لعل نکلا جس کی تراش بالکل آنکھ کی مانند تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "اس لعل کا نام "خونی آنکھ" ہے۔ یہ مجھے افریقہ کی سیر و سیاحت کے زمانے میں ایک خدمت کے عوض ہاتھ لگا تھا۔ اس میں قیمتی ہونے کے علاوہ ایک صفت یہ بھی ہے کہ اگر اسے چرا لیا جائے تو یہ پھر اسی مرتبان میں آ جاتا ہے۔ شاید آپ اس پر یقین نہ کریں' مگر مجھے اس کا اتنا ہی یقین ہے جتنا آپ لوگوں کی اس کمرے میں موجودگی کا۔"

"حضرات۔ اسے چرانے کی کئی بار کوشش کی گئی مگر مجھے افریقہ کی جادوگرنیوں نے ایک ایسا لاجواب منتر بتا دیا ہے کہ فوراً" چور کا پتہ لگ جاتا ہے اور لعل پھر اس مرتبان میں آ کر مقید ہو جاتا ہے۔ میں اس کا بار بار تجربہ کر چکا ہوں۔ آپ چاہے اس پر یقین کریں یا نہ کریں لعل بہت قیمتی ہے کم از کم ۲۰ لاکھ کا ہو گا۔ اتنا بے مثل لعل شاید دنیا کے کسی ذخیرہ میں نہ مل سکے گا۔ آپ اس تاریخی لعل کو دیکھ سکتے

ہیں۔ ہر شخص دیکھ کر اپنے برابر والے مہمان کو دیتا جائے۔"

یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے "خونی آنکھ" اپنے برابر والے آدمی کو دیا۔ یہ ایک بوڑھے بیرسٹر صاحب تھے۔ انہوں نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے روشنی میں دیکھ کر اپنے قریب کے مہمان کو دیا۔ حکیم صاحب نے ہتھیلی پر رکھ کر اندازہ کیا اور مسکرا کر کہا۔ "خدا مبارک کرے۔" یکے بعد دیگرے لعل چلتا ہوا آٹھویں آدمی کے پاس پہنچا۔ اتفاق سے یہ مشہور جوہری نواب دین تھے۔ انہوں نے اسے فنی نگاہ سے جانچا اور کہا۔ "میں نے اتنا وزنی اتنا چمکدار اور صاف لعل کہیں نہیں دیکھا۔"

گیارہویں نمبر پر ایک پروفیسر صاحب بیٹھے تھے۔ انہوں نے بھی اس لعل کو ہاتھ میں لے کر جانچا۔ خوب فلسفیانہ تعریف کی اور چاہتے تھے کہ اپنے برابر کے مہمان اختر صاحب کو دے دیں کہ یکایک کمرے میں تاریکی ہو گئی اور ساتھ ہی لوگوں نے چیخیں مارنی شروع کر دیں۔ ہلڑ مچ گیا اور بد نظمی میں نہ معلوم کیا کیا ہو گیا۔

اختر نے اخروٹ لبوں سے لگا کر غوث بخش کو خبردار کر دیا تھا۔

لوگ حیرت سے ایک دوسرے کو تک رہے تھے، مگر دکھائی کچھ نہ دیتا تھا۔ اندھیرا گھپ اور مہمانوں کی بے ہنگم آوازوں پر ہر شخص پریشان تھا کہ دفعتاً روشنی کیوں بجھ گئی۔

ڈاکٹر لاشاری بھی حیران کھڑے تھے کہ اسی دن تمام بجلی کے تار ٹھیک کرائے گئے تھے۔ یہ دفعتاً برقی سلسلہ میں نقص پیدا ہو جانا کیا معنی رکھتا تھا۔

اس بے انتظامی میں اختر نے پروفیسر کے ہاتھ سے لعل چھین کر اپنے اس بٹوہ میں رکھا جو اس نے ابھی ابھی اپنی جیب سے نکالا تھا اور اس بٹوہ کو فوراً کھلی ہوئی کھڑکی میں سے باہر پائیں باغ میں پھینک دیا۔

اختر نے سوچا تھا رات کو باغ میں کون جائے گا۔ جب وہ یہاں سے فارغ ہو کر نکلے گا تو چلتے وقت بٹوہ اٹھا لے گا اور گھر کا راستہ لے گا۔ کمرے میں اس پر کوئی شبہ نہ کر سکتا تھا کیونکہ لعل پروفیسر تک پہنچا تھا، اس نے تو ہاتھ بھی نہ لگایا تھا۔ نیز وہ خود موجود تھا۔ اس کی جامہ تلاشی لی جا سکتی تھی۔

غوث بخش اپنی کرسی پر آ بیٹھا تھا۔

ڈاکٹر لاشاری نے فوراً نوکر کو آواز دی۔ وہ دوڑا ہوا آیا اور جلدی سے جا کر بجلی کا بٹن دبایا۔ روشنی ہوئی تو لوگوں کی جان میں جان آئی۔

پروفیسر نے گھبرا کر جلدی سے کہا۔ "حضرات۔ لعل غائب ہو گیا۔"

"کیا غائب ہو گیا؟" ڈاکٹر لاشاری نے پوچھا۔

"خونی آنکھ۔"

"اچھا۔"

سب مہمان ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ یہ کس ذات شریف کا کام تھا۔ کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ لعل کس نے اٹھا لیا۔ پروفیسر بے چارا بہت کھسیانا ہو رہا تھا کیونکہ لعل اس کے ہاتھوں سے غائب ہوا تھا مگر اسے معلوم نہ تھا کہ روشنی گل ہو جانے پر جب تاریکی پھیلی تھی۔ اس وقت کس نے اس کے ہاتھ سے جھپٹا مار کر لعل چھینا تھا۔

ڈاکٹر لاشاری نے مسکراتے ہوئے حاضرین کو مخاطب کیا۔ "بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آج کی دعوت میں کوئی شاطر چور بھی تشریف لے آئے تھے۔ وہ لعل چرانے سے زیادہ اس روایت کی تصدیق کرنا چاہتے تھے کہ مسروقہ لعل مرتبان میں دوبارہ واپس آتا ہے یا نہیں۔ خیر۔ مجھے بھی منتر یاد ہے۔ ابھی معلوم کئے لیتا ہوں یہ کس کا کام ہے؟ کوئی صاحب اپنی جگہ سے نہ اٹھیں۔ لیاقت۔ تم کمرے کے دروازے بند کر دو۔ اس کھڑکی کو کیوں کھولا تھا۔ اسے بھی بند کر دو۔"

"حضور۔ چند لوگوں کو گرمی لگ رہی تھی۔ اس وجہ سے میں نے مناسب سمجھا کہ تازہ ہوا آنے کے لئے کھڑکی کھول دوں۔"

"اچھا جاؤ۔"

"حضرات آپ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہیں۔ میں ابھی چور کا پتہ چلا لیتا ہوں۔ منتر کے لئے ضروری انتظامات مکمل کر لوں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے میز پر سے مرتبان اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد عجیب چہ میگوئیاں ہوئیں۔ دوستوں نے ایک دوسرے کو چوری کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب پھر واپس آ گئے۔ اس وقت ان کے پاس

مرتبان نہ تھا۔

حضرات آپ لوگ قطار بنا کر بلیئرڈ روم میں چلئے۔ دیکھو لیاقت۔ کوئی شخص پیچھے نہ رہ جائے۔"

سب لوگ قطار بنا کر بلیئرڈ روم کی جانب روانہ ہوئے۔ اختر اور غوث بخش بھی برابر چل رہے تھے۔

بلیئرڈ روم میں ایک لمبی میز بلیئرڈ کھیلنے کے لئے رکھی ہوئی تھی اس کے دوسری طرف ایک چھوٹی سی میز کمرے کی دیوار سے لگی ہوئی رکھی تھی جس پر وہی سیاہ مرتبان رکھا ہوا تھا۔

"آپ لوگ اس بلیئرڈ ٹیبل کے اس جانب قطار باندھ کر کھڑے ہو جائیں اور پھر ایک ایک کر کے میز کے اس طرف ہوتے ہوئے چکر کھا کر اس سامنے والی میز کے قریب سے گزریئے جس پر وہ مرتبان رکھا ہوا نظر آ رہا ہے۔ جب آپ اس کے سامنے سے گزریں تو اپنا سیدھا ہاتھ اس کے اوپر چھوتے ہوئے گزر جائیں اور چکر کاٹ کر اس دیوار کے ساتھ ساتھ کھڑے ہوتے چلے جائیں۔ یہ عمل ہر شخص نے کرنا ہو گا۔ جو چور ہو گا' جو یقیناً" اسی مختصر مجمع میں ہے' جب اس مرتبان پر ہاتھ لگائے گا' یہ فوراً" جادو کے زور سے پکارے گا کہ یہ چور ہے۔ جو لوگ معصوم و بے گناہ ہیں بے ضرر چھو کر گزر جائیں گے مگر چور جونہی اسے ہاتھ لگائے گا' یہ فوراً" بتا دے گا کہ یہی شخص لعل کا چور ہے۔ اس مرتبان میں یہ خوبی لاکھ روپے کی ہے بلکہ لعل کو محفوظ رکھنے میں یہ مرتبان معجزے کا کام دیتا ہے۔"

منطقی پروفیسر کی رگ استدلال پھڑک اٹھی اور وہ بیتاب ہو کر بولے۔ "کیا بے وقوفی کی باتیں کرتے ہو۔ جبشیوں میں رہ کر تمہاری عقل بھی ماری گئی۔ بھلا یہ بے جان مرتبان بول سکتا ہے ارے میاں۔ دیوانے کیوں ہو گئے ہو۔ ابھی تو کچھ نہیں گیا۔ اپنے اس شعبدہ کو بس یہاں تک ہی محدود رکھو۔ جلد پولیس کو مطلع کرو۔ وہ تحقیقات شروع کر دے گی۔ اس جادو وادو سے کیا ہو گا۔ جلد کام کرو عجیب لاپروا آدمی ہو۔"

"پروفیسر صاحب۔ آپ ذرا صبر کیجئے۔ پولیس کو کیوں خبر کروں۔ جب یہ جادو

کا مرتبان خود بتا دے گا کہ چور فلاں شخص ہے۔ مجھے اس قسم کے بیسیوں تجربے ہو چکے ہیں۔ اس مرتبان نے کبھی خطا نہیں کی۔ اس پر افریقی دیوتا کا سایہ ہے۔"

یکے بعد دیگرے سب لوگوں نے گزرنا شروع کیا اور ہر ایک مرتبان کو ہاتھ لگا کر بلیئرڈ روم کی دوسری دیوار کے ساتھ ساتھ کھڑا ہونے لگا۔ اختر اور غوث بخش قطار کے آخر میں کھڑے تھے۔ اختر کی پیشانی پر پسینہ آ رہا تھا اور اضطراب کی وجہ سے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

جب آخری آدمی اور خود ڈاکٹر صاحب نے مرتبان کو ہاتھ لگایا تو دفعتاً" اس کمرے کی روشنی بھی گل ہو گئی۔

☆○☆

سب لوگ اندھیرے میں دیوار کے قریب کھڑے تھے کہ ایک منٹ بعد پھر روشنی ہو گئی اور ڈاکٹر صاحب نے باواز بلند حکم دیتے ہوئے کہا۔ "اب ہر شخص اپنا اپنا سیدھ ہاتھ روشنی میں کر کے دیکھے۔ ہر شخص کے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی اور انگلیاں سیاہ ہیں سوائے مسٹر اختر کے۔"

ہر ایک ہکا بکا ہو کر اختر کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے بھی روشنی میں دیکھا۔ سب لوگوں کی انگلیاں اور ہتھیلیاں کالی تھیں۔ لیکن اس کی انگلی پر کوئی دھبہ نہ تھا۔ بالکل سفید تھی۔

ڈاکٹر لاشاری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں آپ لوگوں کو زیادہ دیر تک حیران رکھنا نہیں چاہتا۔ حقیقتاً" یہ مرتبان "پراسرار" نہیں ہے بلکہ چوروں کو دھوکہ دینے کی غرض سے میں نے یہ افواہ مشہور کر رکھی تھی۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ پروفیسر صاحب کے ہاتھ سے لعل چوری ہو گیا تو میں نے بظاہر ان پر شبہ کرنے کے ان کے قریبی مہمان پر شبہ کیا' کیونکہ مسٹر اختر ایک عرصہ سے اسے للچائی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے مرتبان اٹھایا اور باورچی خانہ میں پہنچا۔ وہاں اسے مٹی کے تیل کے لیپ پر رکھ کر اس پر کاجل اتار لیا جس سے اس کی بیرونی سطح پر کلونس جم گئی لیکن سیاہ ہونے کی وجہ سے وہ ممیتز نہ ہو سکی۔ پھر اس مرتبان کو بلیئرڈ روم میں لے جا کر رکھا اور اسے چھونے کے لئے آپ سے کہا۔ غالباً" آپ نے مثل سنی

ہو گی کہ "چور کی داڑھی میں تنکا" ہو تا ہے۔ وہ مثل آج اصل ہو گئی۔ سب نے اس مرتبان کو چھوا' کیونکہ وہ معصوم تھے لیکن جس شخص کا ضمیر مجرم تھا' اس نے مرتبان کو ہاتھ نہیں لگایا کہ مبادا یہ مرتبان چغلی کھا جائے اور اس کا نام طشت از بام ہو جائے۔"

ابھی یہ جملہ پورا نہ ہونے پایا تھا کہ ایک نوکر دوڑتا ہوا آیا اور کہا۔ "حضور لعل مل گیا؟"

"کہاں ہے؟"

نوکر نے لعل ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "یہ رہا۔"

ڈاکٹر صاحب نے لعل ہاتھ میں لے کر سب حاضرین کو دکھایا اور فخریہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیوں حضرات یہی وہ لعل ہے جو چند منٹ پہلے چوری ہوا تھا اور جو اب مرتبان میں روایت کے بموجب واپس آتا ہے؟" ڈاکٹر لاشاری نے سیاہ مرتبان میں لعل کو پھر مقید کر دیا۔

یہ بٹوہ وہی تھا جو اختر نے کھڑکی کے باہر پھینکا تھا۔ ڈاکٹر لاشاریؔ نے اسے کھولا تو اندر سے ایک موٹا سا اخروٹ نکلا۔

ڈاکٹر لاشاری مسکرائے اور معاملے کی تہ تک فوراً" پہنچ گئے۔ مہمانوں کو مخاطب کر کے کہا۔ "حضرات واقعہ یہ ہوا کہ اختر نے جلدی اور گھبراہٹ میں بجائے لعل کے اخروٹ اپنے بٹوہ میں رکھ کر کھڑکی کے باہر پھینک دیا تھا اور اندھیرے گھپ میں لعل جسے اختر اخروٹ سمجھ چکا تھا' میز کے نیچے گر پڑا جس کی طرف اس نے مطلق دھیان نہیں کیا لیکن لعل کے متعلق یہ افواہ مشہور تھی کہ وہ ضرور مرتبان میں واپس آ جاتا ہے' اس لئے وہ پھر اس توہم پرستی کی روایت کو قائم رکھنے کے لئے مرتبان کی چہار دیواری میں آ پہنچا۔ شاید اب کسی صاحب کو بھی کسی مزید تصدیق کی ضرورت نہ ہو گی۔ کیوں اختر صاحب؟"

اختر صاحب شرم سے زمین میں گڑے جا رہے تھے۔ غوث بخش صاحب رفو چکر ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر لاشاری فاتحانہ انداز میں ان کو دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆